بسم اللہ الرحمن الرحیم

فسانہ سعید

مصنفہ

مصور غم علامہ راشد الخیری مدظلہ

مصنف

صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی، نوحہ زندگی، منازل السائرہ، سراب مغرب
بنت الوقت، الزہرا، جوہر عصمت، روداد قفس، جوہر قدامت، یاسمین شام
موءودہ، سمرنا کا چاند، رسول کی بیویاں وغیرہ

جسکو

غزالی مینجر رسالہ درویش دہلی

نے باخذ اجازت

مولانا سید عزیز حسن البقائی نقشبندی دہلوی

عبد المجید کے

حمیدیہ پریس دہلی میں
چھپوایا

۸ر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۱)

سعید کا بچپن ہماری آنکھ کے سامنے ہے، ایسی خاموش بچی مرزا حمید کی سات پشتوں میں بہی پیدا نہ ہوئی ہوگی اس کی طبیعت شروع ہی سے اطاعت و فرمانبرداری کے بیش بہا جواہرات سے مالا مال تہی، ہم نے خود وہ سماں نہ دیکھا ہو مگر ہمارے سامنے وہ شاہد موجود ہیں جنہوں نے ایک آدھ بار نہیں بارہا دیکھا، کہ ماں باپ یا بڑے بہن بھائی نہیں چہوٹوں نے اسکو مارا اور وہ خاموش غلط سلط شکایت کی اور وہ چپ چہوٹ سچ الزام اٹھائے اور وہ گونگی بنی کھڑی ہے، رشیدہ کہنے کو تو چہوٹی تہی اور ایک آدھ سال نہیں کُٹہی تین بلکہ ساڑہے تین سال، مگر ایسی شریر اور چالاک کہ مغز سے باتیں اتارتی اور ایسی لگاتی کہ خواہ مخواہ یقین آجاتا، بھلا یہ بہی کوئی موقعہ تہا کہ دونوں میٹھی گڑیاں کھیل رہی تھیں، سعید کی چہنی کے منہ پر سیاہی کا ایک دھبہ سا لگ گیا تھا کہنے لگی، لے دیکھ، جیسی تو خود جہوٹی لپاٹن ہے ایسی ہی تیری چہنی، جہنیجی منہ کالا ہو گیا، اب تیرا بہی آج ہی کل میں ہونیوالا ہے، سعید اتنا سنتے ہی گھبرا گئی، اور رشیدہ سے کہا بوا میں تو کبہی جہوٹ نہیں بولتی اس نے جہوٹ بولا ہوگا، جو اس کا منہ کالا ہو گیا، اے بے رشیدہ کیا میرا بہی منہ کالا ہو جائے گا، اس وقت سعید کی عمر نو اور رشیدہ پانچ ساڑہے پانچ سال کی ہوگی اور کون سمجھ سکتا تہا کہ اس سے مطلب رشیدہ کا تہا کیا، سعید خاموش ہو گئی، مگر رشیدہ کا مقصد پورا نہ ہوا تہا، اور اس کوشش کی تہ میں ایک غرض پوشیدہ تہی بہن کو خاموش دیکھ کر یہ تو وہ اچہی طرح سمجھ گئی کہ کام بن گیا، مگر ضرورت تہی کہ کام پورا ہو جائے

ہنسی اور ہنسکر کہا لاکہہ تم جھوٹ نہ بولو مگر تمہاری چھنی تو جھوٹی ہے، روز میں دیکھتی ہوں، کہ لگائی بجھائی کرتی رہتی ہے، اب اس کا تو کالا ہو چکا، اگر یہ تمہارے پاس رہی تو تمہارا بھی کالا ہو جائے گا، اور ایسا کالا کہ پھر عمر بھر سفید نہیں ہو سکتا، ایسی چھنی کو آپا کیا آگ لگاؤ گی، چھنیوں کی کچھ کمی تھوڑی ہے اور لے لینا، اس بے ایمانی کو نکال باہر کرو، اتنا کہکر رشیدہ نے چھنی ہاتھ میں اٹھالی، بہن کا ہاتھ تو سعیدہ نہ روک سکی مگر چھنی کی محبت میں کھڑی ضرور ہو گئی، رشیدہ نے دروازہ پر آ کر چھنی باہر پھینکدی، اور کہا وہ ہو مردار اپنا منہ تو کالا کر چکی آپا کا بھی کرے گی، یہ فقرہ ختم کرتے ہی خواہ مخواہ آواز دی "ہاں یہاں ہیں آئی ہیں"، "جاؤ بی آپا اماں بلا رہی ہیں" سعیدہ یہ سنتے ہی ماں کے پاس پہونچی، اور رشیدہ نے چھنی اٹھا جھٹ اپنی گڑیوں میں لاکر رکھدی، سعیدہ ماں کے پاس پہونچی تو اس نے کہا میں نے تو نہیں بلایا، وہ کم بخت یوں ہی باتیں لگایا کرتی ہے بلا تو بھی اسکو، رشیدہ کیا اس مرحلہ سے بے خبر تھی، وہ پہلے ہی کھڑی سنگنیاں لے رہی تھی، ماں کی اتنی آواز سنتے ہی آگے بڑھی اور کہنے لگی، یہ دروازہ میں کھڑی جھانک رہی تھیں ابا جان کے آنے کا وقت تھا میں نے کہا وہ آرہے ہوں گے، ان سے یوں کہتی تو کیا سنتیں، میں نے کہدیا کہ اماں بلا رہی ہیں، اس دن دیکھیے میں فقط کھڑی ہوئی تھی وہ آگئے کس قدر خفا ہوئے ہیں، اور آپ کی بھی فضیحتیاں کی ہیں، اس کے جواب میں سعیدہ کی طاقت نہ ہمت حالانکہ ضرورت تھی لیکن کرتی کیا خاموش کھڑی ہو گئی، ماں نے رشیدہ کو سچ سمجھکر کہدیا کہ تو نے اچھا کیا اس بدنصیب کو کسی بات کا خیال ہی نہیں رہتا، ہاں آنے کا تو وقت ہے ہی اس کا کیا بگڑتا غصہ تو میرے اوپر اترتا، اس قسم کی ایک دو نہیں بیسیوں باتیں ہوتیں اور کبھی کبھار نہیں اکثر بلکہ دن رات، اور خود ماں اور باپ دونوں اپنے بچوں کی عادت اور سعیدہ کی غربت سے اچھی طرح واقف تھے لیکن رشیدہ کے مقابلہ میں جب کبھی سعیدہ کا کوئی معاملہ آ کر پڑا ہے ہم نے نہیں سنا کہ اس کی خموشی نے نقصان نہ پہونچایا ہو،

اس طبیعت کا نتیجہ یہ تھا کہ خواہ مخواہ کی فضیحتیاں بلا وجہ کی گھرکیاں سعید کی تقدیر میں تھیں آس نہ پاس واسطہ نہ غرض دونوں لڑکے انگنائی میں گیند بلا کھیل رہے تھے، بڑے نے مارا بلا گیند کمرے میں اور کمرے کے بھی بیچ کے طاق میں شیشہ کی صراحی چھن سے، دن دہاڑے کا معاملہ ایک دو کے نہیں سارے گھر کا دیکھا دکھایا مگر ماں کے پاس خبر پہنچی تو دو بھائی صاف مکر گئے، اور سعید کا نام لگا دیا، اب ماں ہر چند دریافت کرتی ہے، پوچھتی ہے بگڑتی ہے لیکن وہ بجائے اسکے کہ دونوں کو جھٹلائے اور کہے کہ انا نے دیکھا ماما نے دیکھا، رشیدہ موجود تھی، خاموش کھڑی منہ تک رہی ہے، اب بچوں کو سچا اور اس گونگی کو مجرم نہ سمجھنے کی وجہ کیا؟

حمید کچھ دوستوں کی صحبت کچھ زمانہ کی رفتار سے تعلیم نسواں کا دل سے حامی تھا اور اسقدر حامی کہ اگر اس کا بس چلتا تو بچیوں کو مشن تک بھیجنے میں متامل نہ تھا، لیکن بیوی چونکہ ایک کٹے ملا کی بیٹی تھی اس نے پڑھنے لکھنے پر تو کبھی اعتراض کیا نہیں البتہ مشن کی مخالفت میں کسر نہ کی بعض دفعہ اسی خیال کی مخالفت نے حمید کو غیر معمولی اذیت پہونچائی، اور وہ سمجھا کہ بیوی قطعاً جاہل ہے، لیکن بیوی چونکہ خود خاصی پڑھی لکھی تھی، اس لیے اس نے صرف زبان سے منع نہیں کیا بلکہ عملی طور پر بھی میاں کو بچیوں کی تعلیم میں مدد دی، گو ایک چھوڑ دو دو استانیوں کا انتظام خود کیا لیکن اس پر بھی وہ ان کے ساتھ خود لگی ہی رہتی، اور خانہ داری کے جھگڑوں سے جب فرصت ملتی اور جتنی ملتی وہ مقدم بچیوں کی تعلیم اور نگہداشت پر صرف کرتی، ان حالات میں حمید کو حق نہ تھا کہ وہ بیوی کی مخالفت کو صرف اس لیے کہ ملانے کی مخالفت کو وقعت دیتا اور زبردستی بچیوں کو مشن میں بھیج دیتا وہ دیکھ رہا تھا کہ مشن کی لڑکیاں جو کچھ پڑھ اور لکھ رہی ہیں وہ میری بچیاں گھر بیٹھے سیکھ رہی ہیں ہاں ایک بات ضرور تھی اور وہ یہ کہ جو چستی اور چالاکی جو طراری اور تیزی وہ مشن کی لڑکیوں میں پاتا

والی لڑکیوں میں نہیں اسی لئے اس کو اکثر تشویش رہی اور خود ہمیشہ اس فکر میں رہا
کہ جس طرح بھی ہو سکے ان کو زمانہ کی رفتار کا اندازہ ہو اور یہ جو بڑی ہو رہی ہیں بل کہ جاہل
مطلق رہیں گی، اس کا بار صرف میری گردن پر ہے،

اس فیصلے نے حمید کو آمادہ کر دیا، کہ وہ اب بیوی کی مطلق پروا نہ کرے اور بچیوں کو
مشن میں داخل کر دے، اسی سلسلہ میں اس نے ایک روز رات کے وقت کھانے
سے فارغ ہونے کے بعد بیوی سے پوچھا،

"بچیوں کے پاس کپڑوں کے جوڑے معقول ہیں"

بیوی۔ میں سمجھ نہ سکی کیا مطلب ہے،

حمید۔ میں ان کو مشن میں داخل کرنا چاہتا ہوں،

بیوی۔ پھر وہی ہٹ لگ اٹھی،

حمید۔ فضول باتوں سے فائدہ نہیں، جواب دو۔

بیوی۔ معقول باتیں فضول نہیں ہو سکتیں،

حمید۔ تم کو معلوم نہیں کہ لڑکیوں کی تمام خرابیوں کے ذمہ دار ان کے والدین ہیں،
ایک معقول اور تعلیم یافتہ شوہر دن بھر کی محنت اور مشقت کے بعد گھر میں گھستا ہے تو اس
کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ایک ایسی عورت بیوی ہونے کی حیثیت سے اس کے سامنے
آئے جو اپنی صورت سیرت عادت خصلت سے اس کا غم غلط کرے اس کی طبیعت گوارا
نہیں کرتی کہ ایک جاہل مطلق گندی بدصورت عورت اس کو خانہ داری کے جھگڑوں میں
پھنسا کر اور زیادہ پریشان کرے بچیاں اگر دس ہزار کے زیور سے آراستہ و پیراستہ ہوں تو وہ
فضول ہے جب تک وہ تعلیم کے زیور سے مزین نہ ہوں،

بیوی۔ تو کیا تمہاری رائے یہ ہے کہ میری بچیاں مشن میں یا کسی اور جگہ جا کر اس سے
زیادہ تعلیم حاصل کر سکتی ہیں، جو ان کو یہاں مل سکتی ہے آخر [illegible] تعلیم [illegible]

گئی ہے، میں مشن کی اکثر لڑکیوں کو دیکھ چکی ہوں اور خود حسنہ سے روز ملتی رہتی ہوں،
جس وقت تمہارا جی چاہے اپنی بچیوں کا اس سے مقابلہ کرلو، حالانکہ سعید اُس سے
ڈیڑھ سال چھوٹی ہے،

حمید، ہاں تم سمجھ ہی نہیں سکیں کہ میرا مقصد کیا ہے محض تعلیم ہی کی ضرورت نہیں
عورت کو اور چیز کی بھی ضرورت ہے،

بیوی، ہاں تو وہ بھی بتاؤ کہ مشن میں جاکر اور کیا سیکھنا ہے،

حمید، سب سے بڑی بات تو چالاکی ہے جو ان دونوں میں اور بالخصوص سعید میں مطلق
نہیں یہ تو ٹھس پتھر ہے کہ اس کی طبیعت میں کسی بات کا احساس ہی نہیں، میں نے
کبھی کوئی امنگ ہی اس کے دل میں نہ دیکھی، غضب خدا کا محرم میں دنیا بھر کی
لڑکیاں کوٹھے پر تماشا دیکھنے چڑھیں اور یہ کم بخت تب بھی نیچے ہی بیٹھی رہی، کیا
ایسی ٹھوس طبیعت کی عورت سے تم یہ توقع رکھتی ہو کہ وہ شوہر کو خوش رکھ سکتی ہے،
یہ تو عورت کیا ایک مٹی کا تھوا یا آٹے کی آہا ہوگی جس کا عدم وجود سب برابر ہے کسی صلاح
مشورے کی یہ نہیں کسی بات چیت کی یہ نہیں، ایک بُت ہے کہ سامنے بیٹھا ہے،

بیوی، تو تمہاری رائے میں منجملہ دوسری باتوں کے بیوی میں چالاکی کا ہونا بھی ضروری
اور شوہر کو سیدھی عورت کے مقابلہ میں چالاک عورت زیادہ پسند ہونی چاہیے،

حمید، چالاک کے معنی جو میں سمجھتا ہوں وہ شاید تم نہیں سمجھیں میرا مقصد چالاک سے
یہ ہے کہ مریل اور گوشت کا لوتھڑا نہ ہو،

بیوی، مگر فطرت کا بدلنا تو میری رائے میں مشکل سے ممکن ہے،

حمید، یہ فطرت نہیں اسباب پر منحصر ہے اگر تم اس کو مشن میں بھیجو یہ وہاں جاکر ہم عمر
لڑکیوں میں بیٹھے ہنسے بولے کھیلے کودے تو ضرور تیز ہو جائے گی،

بیوی، اگر اسلئے تم ضروری خیال کرتے ہو کہ یہ غنیمت و بکار [illegible]

حمید، مطلب نہ سمجھا پھر کہو،

بیوی، لڑکیوں کو آنکھ سے اوجھل کرنا میرے خیال میں ہرگز مناسب نہیں، بچیاں والدین کے پاس شوہروں کی امانت ہیں، اور ان کا کوارہ پنے کا زمانہ جب وہ سیانی ہو جائیں والدین کے واسطے بہت بڑی ذمہ داری ہے، اگر میرا خیال غلط نہو تو میں کہونگی کہ میں گھر کی ذمہ داری سے جو ایک بیوی پر ہے کواری بچی کی ذمہ داری کو زیادہ ضروری سمجھتی ہوں،

حمید، یہ درست سہی لیکن کیا دن دہاڑے ڈاکہ پڑ رہا ہے کہ لڑکیاں مشن میں جا کر آوارہ ہو جائینگی

بیوی، میں یہ تو نہیں کہتی بلکہ اس قسم کے واقعات سے میرے اور تمہارے، دونوں کے کان آشنا ہیں، تم نے بھی سنا اور میں نے بھی، تم نے بھی دیکھا اور میں نے بھی کہ میراچھن کی لڑکی کا کیا حشر ہوا، نصیر منڈے کی بہن پر کیا گذری،

حمید، ہاں مجھے معلوم ہے، اس کے بعد کیا مدرسہ بند ہو گیا، اور اب ہاں لڑکیاں تعلیم نہیں پاتیں،

بیوی، میں یہ تو نہیں کہتی لیکن ایک اندیشہ کا امکان تو ہے،

حمید، اگر احتیاط کیجائے تو کچھ اندیشہ نہیں،

بیوی، تمہاری گفتگو سے میں تو یہ سمجھ رہی ہوں کہ عصمت جس کو میں دنیا کی ہر بیش قیمت سے بیش قیمت چیز کے مقابلہ میں قیمتی سمجھتی ہوں، تمہاری رائے میں کوئی وقعت نہیں رکھتی، والدین لڑکیوں کی عصمت کے محافظ ہیں، اور اگر وہ اس فرض کی ادائگی میں غفلت کریں تو نہ صرف اس لئے کہ شرم و حیا کی وجہ سے وہ خودکشی کریں، بلکہ شرعاً اور ایماناً بھی ان کو خودکشی کر لینی چاہیئے، ان کو دنیا میں زندہ رہنے کا حق نہیں، بلکہ میں تو یہ کہونگی کہ وہ خدا کے سامنے جانے اور منہ دکھانے کے قابل نہیں

حمید، میں اس خیال سے متفق ہوں اور عصمت کو ہر لڑکی کیواسطے دنیا میں نہایت ضروری

سمجھتا ہوں جتنا تم لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ وہ اس کے واسطے دنیا کی ہر
کیفیت سے محروم ہو جائے ہم ایک لڑکی کو ایک شخص کے نکاح میں دیتے ہیں
ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو اس قابل بنا کر بھیجیں کہ وہ اپنے شوہر کی ہمیشہ رفیق لاجواب
غمگسار اور بے نظیر دوست ہو، اگر لڑکی ان تمام صفات سے موصوف نہیں تو اسکے
ذمہ دار والدین ہیں، اور اگر بیوی ان نقائص کا جو والدین کی غفلت سے اس میں پیدا
ہوئے خمیازہ بھگتے تو والدین کو شکایت کا حق نہیں، انہوں نے لڑکی کو اس قابل بنایا
ہی نہیں کہ شوہر اس سے محبت کرے،

بیوی، ہاں یہاں مجھے تم سے اختلاف ہے میں عصمت کو سب سے مقدم سمجھتی ہوں،

حمید، یہ تو میں خود کہہ رہا ہوں لیکن ایک گوشت کا لوتھڑا عورت ہرگز شوہر کی تمام
ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتی،

بیوی، یہاں بحث کا وہی حصہ شروع ہوتا ہے غالباً تمہارا منشا یہ ہے کہ وہ طرار ہو ہوشیار ہو،

حمید، یقیناً یہی ہے،

بیوی، مجھے پھر تم سے اختلاف ہے،

حمید، کیا؟

بیوی، وہی عصمت!

حمید، میں خود اسکو مقدم رکھ رہا ہوں،

بیوی، ہم مسلمان ہیں ہم کو جن خوبیوں سے اپنی بچیوں کو آراستہ کرنا مقصود ہے ان کے
اسباب ہمارے پاس موجود نہیں، جو باتیں ہمارے امکان میں ہیں اگر ہم ان سے
دریغ کریں اور بچیوں کو مستفید نہ ہونے دیں تو یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے غفلت کی،
لیکن جو امکان سے باہر ہے اس کا علاج ہم کیا کر سکتے ہیں،

حمید، تعلیم سب سے زیادہ ضروری چیز ہے، اور جو چیز جاہل اور پڑھے لکھے، لڑکوں

ہیں مابہ الامتیاز ہے وہ صرف تعلیم ہے لڑکیوں کو صرف تعلیم ہی انسان بنا سکتی ہے
اور وہ اس قابل ہونگی کہ شوہر کو رضا مند رکھہ سکیں، اور رضا مند نہیں بلکہ یوں کہو
کہ شوہروں کے ساتھہ اطمینان سے زندگی بسر کر سکیں، جو شوہروں کو خوش رکھیں گی
ان کو خود بھی خوش رہنے کا حق حاصل ہے،

بیوی میں اس خیال سے تو متفق ہوں کہ تعلیم کسی حال میں مضر نہیں لیکن ہم تعلیم کو
اس حد تک ضروری سمجھیں گے، جہاں تک عصمت کا سوال پیدا نہ ہو مگر جس جگہ دنیا
بھر کی یقین اور عین الیقین کے معاملہ میں عصمت کے ضایع ہونے کا ذرہ بھر بھی احتمال
ہو وہاں تعلیم کا وزن کچھہ نہیں رہتا،

حمید یہ خیال درست نہیں، تم اسکے شوہر کے سامنے یہ عذر پیش نہیں کر سکتیں،

بیوی نہیں یہ بات نہیں ہے، ہم کو پیش کرنے کا حق حاصل ہے، اور گو ایک بھولی بھالی
سیدہی سادی لڑکی تمہارے اصول کو پیش نظر رکھکر اس کا چالاک نہ ہونا بھی ایک
جرم ہے، مجرم سمجھہ لی جائے، تاہم اس کی سادگی اور سیدہا پن بھی، قابل
وقعت ہے، اگر شوہر ایمان رکھتا ہے، تو وہ اس کی بھی قدر کریگا لیکن اس بحث
کو جانے دو، اور معاملہ کے اس رستے پر آؤ کہ ہم نے ایک لڑکی کو ان تمام خوبیوں
سے جو ہمارے امکان میں تھیں مالا مال کر دیا، لیکن اس لیے کہ اس کا سب سے بڑا
جوہر عصمت ہماری نگاہ میں بیش بہا تہا، اسکو محفوظ رکہنے کے واسطے بعض خوبیوں
سے محروم رکہا تو وہ ہرگز قابل گرفت نہیں، اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ والدین
نے غفلت کی،

حمید بس تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ ہمارے لیے مشن کی تعلیم نا جائز

بیوی میں یہ نہیں کہتی،

حمید پھر کیا کہتی ہو،

بیوی ۔ سعید کی عمر اس قابل نہیں کہ وہ ایک لمحہ بھی میری آنکھ سے اوجھل ہو،
حمید ۔ خواہ اس میں کتنا ہی نقصان ہو،
بیوی ۔ بیشک،
حمید ۔ نتیجہ وہی نکلا،
بیوی ۔ نکلے،

(۳)

اس طبیعت کی لڑکی جس کی فطرت میں خموشی تھی، ماکی تربیت میں جوان ہوئی صرف کہنے کو انسان تھی ورنہ انسانیت کے اکثر جذبات اس سے ہزاروں کوس دور تھے، حد یہ ہے کہ کھانا کپڑا کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کا شوق اس کی طبیعت میں پایا جاتا کبھی کسی زیور کی طرف اس کی رغبت نہ ہوتی کسی اچھی غذا کی طرف اس کا مائل ہونا ناممکن تھا جو ملگیا اور سامنے آگیا وہ ہی غنیمت تھا اور کافی تھا برسات کے موسم میں حمید اکثر باغوں میں جاتا بیوی بچے ساتھ ہوتے، اور یہ وہ موسم تھا جس کے نام سے دل میں امنگ پیدا ہوتی ہے، مگر اس کیواسطے ہر خواہش قسم اور ہر امنگ گناہ تھی، یہ نہ تھا کہ وہ ساتھ نہ جاتی ہو یا کھانے پینے میں شریک نہ ہوتی ہو، وہ باغوں میں جاتی، جھولے جھولتی، آم کھاتی، شربت پیتی، مگر اس کی شرکت علی الاعلان بتا رہی تھی کہ ان تمام مسرتوں کا عدم اور وجود اس کے واسطے برابر ہے، مینہ اگر جھم جھم پڑتا ہے تو اور گرمی ساعت بہ ساعت ترقی کرے تو اس کے واسطے دونو باتیں یکساں تھیں، شروع شروع میں ماکو اس کی یہ طبیعت دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور ایک آدہ دفعہ اس نے کہا بھی، لیکن اس کو اس کا افسوس نہیں ہوا، ایک دفعہ پر جب حمید نے یہ کہا کہ دیکھیئے اس کا حشر کیا ہوتا ہے تو اس نے صاف کہدیا، کہ ایسی دبی دبائی لڑکیاں نصیب کہاں، ذرا دنیا کی لڑکیاں دیکھو تو آنکھیں کھل جائیں،

حقاقہ وقاقہ چیرو چار گہار دپانچ نوج ایسی بیویاں گھروں میں آئیں کہ کہو لومیاں
منقنع اور گھر سنبھالوں اپنا تیسرے ہی دن میاں کی پگڑی اور اپنا دوپٹہ بیچ کھائیں
جس کو نوسے ہزار دفعہ غرض ہو گی آئے گا اور ہاتھہ جوڑ کرلے جائے گا حمید اس قسم
کی باتوں پر جب کبھی بیوی کرتی ہنستا اور یہ سمجھتا کہ مولون ہیر دقیانوسی خیالات
رگ رگ میں گھسے ہوئے ہیں،

ماباپ کا یہ اختلاف ایسا نہ تھا جو خود سعید سے پوشیدہ رہتا، وہ دن رات
دونوں کے خیالات دیکھتی اور سنتی، اور خود باپ نے بھی کئی مرتبہ بیوی کی موجودگی میں
سعید سے کہا کہ بیٹی ذرا دنیا پر نظر ڈالو عمر کاٹنی ہے آخر کب تک اس طرح آٹے کی
آپا ہی بیٹھی رہو گی، مگر وہ ارادتاً ہر معاملہ سے علحدہ رہتی باپ کے سامنے اُس لئے
ہمیشہ نیچی گردن کر آنکھیں جھکالیں، چاہیئے کہ باپ کے کہنے کا اثر ہوتا اور رشیدہ کی
طرح دنیا سازی کرتی مطلق نہیں ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ باپ کی خدمت ماں کی اطاعت
گھر کی ضرورت کا خیال ہر بچہ سے زیادہ رکھتی، کتاب سے فرصت پا کر زیادہ وقت
گھر کے دھندوں میں بسر کرتی، یہ اس کی تقدیر کہ تین گھنٹہ میں جل بھن پکا پکو
چاول لائی اور نام ہوا رشیدہ کا،

عمر کے ساتھہ ہی ساتھہ سعید کی عادات وخصائل بھی ترقی کر رہی تھیں جوان
ہوئی تو ایسی ہوئی کہ دن بھر باورچی خانہ یا کوٹھری میں، باپ کے سامنے آنا
بڑے بھائیوں کے روبرو پھرنا ختم ہو گیا، یہ وہ وقت تھا کہ میاں بیوی کے
اختلافات نے اس خاص مسئلہ میں اور زیادہ ترقی کر لی تھی، لڑکے باپ کے ہم
خیال تھے اور ہرگز پسند نہ کرتے کہ سعید بہن ہو کر کوٹھری میں بند ہو جائے
مگر ماں بچی کی اس افتاد پر مطمئن تھی اور اس نے جھوٹ موٹ بھی کبھی بچی کو روکا نہ ٹوکا
کہ وہ باپ یا بھائی کے سامنے آئے، اور نہ ان کے کہنے پر عمل کرے، جوان لڑکی کے

گھر میں اچھے بُرے بھولے بھٹکے پیغام آتے ہی ہیں سعید کے بھی آئے، مگر حمید نے یہ غضب ڈھایا کہ بیوی سے بچی کے سامنے صاف کہدیا کہ ہر معاملہ میں بچی کی رائے مقدم ہے، پہلی مرتبہ جب بیوی نے میاں کے یہ الفاظ سنے تو دہم ہوگئی، اور اگر سعید سن پاتی تو شاید زمین میں گڑ جاتی، مگر جب متواتر اس قسم کی آوازیں شوہر کی طرف سے بھی اور بچوں کی زبان سے بھی کان میں آئیں تو اس کو بھی مساوات ہوگئی ایک روز مشاطہ ایک ایسا پیغام لائی جس میں وہ تمام باتیں موجود تھیں جن کا حمید متمنی تھا اس نے فوراً تحقیقات شروع کردی، اور جب یہ معلوم ہوا کہ لڑکا ہر اعتبار سے درست ہے اور میں جن باتوں کا خواستگار ہوں، وہ سب اس کی ذات میں موجود ہیں تو شام کے وقت دونوں بچوں کو سامنے بٹھا کر اس نے بیوی سے اس طرح کہا،

میں اس قسم کے لڑکے کی تلاش میں تھا، مجھے اسلام میں وہ تمام باتیں نظر آتی ہیں جن کا میں جو یا تھا، دقیانوسی خیالات کا لڑکا نہیں، تعلیم جدید سے پوری طرح آراستہ ہے، فقیر نہیں کھاتے پیتے باپ کا لڑکا اور خود کماؤ ہے، صورت شکل، عادات اطوار خیالات غرض کوئی فی نہیں، اب تم بسم اللہ کرو اور سب سے پہلے سعید کی رائے لو کہ وہ اس معاملہ میں کیا کہتی ہے،

بیوی، تم نے پہلے بھی کئی مرتبہ میرے سامنے اس قسم کا ذکر کیا، یہ بھی شاید آجکل کا فیشن ہے، کہ لڑکیوں سے رائے لو، حالانکہ اس سے زیادہ لغویت اور کچھ نہیں ہوسکتی، لڑکیوں کی رائے اُس وقت ٹھیک ہوسکتی ہے، اور ایک لڑکیوں کی کیا ہر اس شخص کی جو رائے دینے والا ہے کہ اسکو معاملہ کے ہر پہلو سے پوری طرح واقفیت ہو، بھلا تم ہی بتاؤ جو شخص ایک معاملہ سے واقف ہی نہیں وہ کیا رائے دیگا اگر تمہاری رائے میں اس کی اجازت ضروری ہے تو اس کو اجازت دو کہ وہ گھر سے باہر نکلے اور خود جا کر پہلے لڑکے کو دیکھے، اس کے حالات معلوم کرے اس کی

عادتوں کا، حالتوں کا، خصلتوں کا، باتوں کا اندازہ کرے، کچھ خود دیکھے، کچھ تحقیقات
کرے، اسکے بعد تو اسکی رائے کوئی وقعت رکھہ سکتی ہے اور یہ کہا کہ ایک شخص جان
نہ پہچان واسطہ نہ غرض اسکے معاملہ میں رائے دید و اور رائے بھی اسقدر ذمہ داری کی ان
معاملات میں رائے ماں باپ کی ہوتی ہے جو معاملہ کی اچھی طرح چھان بین کر سکتے ہیں
بغیر واقفیت کے کسی شخص کی رائے ہے کس کام کی،
حمید، تم ہر معاملہ میں الٹی سیدھی باتیں کیا کرتی ہو،
بیوی، یہ تو کوئی الٹی سیدھی بات نہیں،
بڑا لڑکا، اماں جان، دقیانوسی باتوں کو چھوڑ دیجیے،
چھوٹا لڑکا، ہاں!
بیوی، چار آدمیوں کا ملکر کسی شخص کو نکو بنا لینا تو بہت آسان ہے مگر دوسرے کو
قائل کرو یا ہو جاؤ،
حمید، واقعات اس کے سامنے بیان کر دو،
بیوی، ہاں یہ دیکھو اب راستے پر آئے ہو، واقعات کی رائے صائب نہیں ہو سکتی
اس میں غلطی کا احتمال ممکن ہے،
حمید، پھر کیا کیا جائے،
بیوی، خود رائے دو،
حمید، میری رائے میں تو درست ہے،
بیوی، بس تو بسم اللہ کرو،
حمید، مگر خود اس سے رائے نہ لو،
بیوی، ہرگز نہیں،
حمید، گناہ ہے؟

بیوی نہیں مگر مصلحت ہے،
حمید تمہاری ضد دیکھئے کیا دکھاتی ہے،
بیوی یہ تو ضد نہیں معاملہ ہے،

(۳)

تھوڑی سی اختلاف سنے اور معمولی رد و کد کے بعد سعید کا نکاح اسلام سے ہو گیا حمید علاوہ معقول پنشن کے دو سو روپیہ ماہوار کی جائداد کا مالک تھا خوش قسمتی سے بیوی بھی سو سو روپیہ کا کرایہ اور ایک گاؤں جہیز میں لائی تھی سعید کو میکہ سے بہت کچھ ملا، اور حق یہ ہے کہ توقع سے زیادہ ملا، اسلام بی، اے سے فارغ ہو کر وکالت کی کوشش کر رہا تھا اور گو اس کا خیال تھا کہ امتحان کے بعد شادی ہو، مگر چونکہ باپ بارہ مہینہ کا بیمار تھا، اور اس نے اصرار کیا اس لیئے شادی امتحان سے پہلے ہو گئی پہلے سال جبتک اسلام کے سر پر امتحان کا فکر رہا معاملے نے کوئی خاص سہولت اختیار نہ کی، لیکن ادھر تو امتحان میں ہوئی کامیابی، ادھر باپ کو آئی موت، اور سفید و سیاہ کا تمام اختیار اسلام کو ہوا تو عقدہ کھلا کہ اس کی آنکھیں جس چیز کی متلاشی تھیں وہ سعید میں نہ تھیں وہ چاہتا تھا کہ دن بھر کا تھکا ہارا کچہری سے واپس آؤں تو بیوی بن ٹھن کر صحن ہی میں میرا استقبال کرلے اور اگر میرے سر میں درد ہو تو بیوی کا دم نکلجائے، سعید کی کیفیت یہ کہ وہ میاں کو آتا دیکھ شرم کے مارے چند لمحے کے واسطے آنکھ ہی سے اوجھل ہو جائے، کہ کہیں مزاج بگڑ نہ رہا ہو اس تخالف نے اسلام کے کان کھڑے کئے، وہ روز بروز اور لمحہ بہ لمحہ بیوی سے متنفر ہوتا جاتا تھا کئی مرتبہ تو موقع پاکر بیوی سے کہا بھی اور اپنی خواہشیں بھی ظاہر کیں مگر سعید جیسی طبیعت کی لڑکی سے یہ توقع جائز نہ تھی اس کی عادت بدلی گئی نہ بدلی جا سکتی تھی، وہ یہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ اسلام مجھ سے خوش نہیں مگر اسلام کا خوش ہونا اس کے اختیار سے باہر تھا اور یہ قطعاً ناممکن تھا کہ شوہر کی محبت کے

جواب میں اپنی طرف سے بھی اظہار محبت میں کمی نہ کرتی، اور صرف چھ مہینہ کی بیاہی اسلام کے بخار میں پٹی پکڑ کر رات بھر آنسو بہاتی،

ہم اسلام کے ان تمام الزامات سے باخبر ہیں جو اس سلسلہ میں اس نے ساس اور سسروں پر رکھے، ان سب کا خلاصہ یہ تہا کہ اگر سعید موجودہ زمانہ کی تعلیم سے آراستہ ہوتی تو ہرگز اسلام کی زندگی کا یہ حشر نہ ہوتا، مگر اسلام اس معاملہ میں یقیناً حق بجانب نہیں، سعید اس شان کی عورت اور آن کی بیوی تہی کہ اگر اسلام انسان ہوتا تو ایسی بیوی کے پاؤں دہو دہو کر پیتا، یہ صحیح کہ اگر کچہری سے آکر وہ دالان میں قدم رکھنے سے پہلے ہی مصافحہ کرتی تو سعید کا خون چلّوؤں بڑہ جاتا، اور وہ سمجہتا کہ بیوی نہایت معقول پڑہی لکھی اور اپنے فرائض سے باخبر ہے لیکن یہ جو نک دہر چار چلّو خون بڑہا کر اندر ہی اندر جو خون چوستی اور مصیبت ڈہاتی وہ چند ہی روز میں قبر جہکانے والی تہی، سال ڈیڑہ سال کے بعد اسلام کی زبان کا ٹانکا ٹوٹ گیا، اور نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ وہ جو کچہہ منہ میں آتا، دہڑلے سے سناتا، افسوس اس بات کا ہے کہ اس تمام داستان میں ایک حرف بہی ایسا نہیں ملتا کہ بے زبان بیوی نے کبہی بہی طرار شوہر کو جواب دیا ہو، ابہی تک فضیحتیوں میں صرف اس کی ذات شامل تہی، اب اس کے باپ دادا اور پردادا بہی شامل ہو گئے،

(۴)

اسلام کے ماموں جو بنگال میں کہیں سررشتہ دار تھے تین مہینہ کی چہٹی لیکر گھر آئے بہانجے نے دعوت کی اور بیوی سے کہدیا کہ آج چار آدمیوں کا کہانا زیادہ پکے گا، ماموں جان اور ان کے ساتھ تین آدمی اور، گو اسلام کا بیان یہ ہے کہ سعید نے مطلق توجہ نہ کی، اور ماماؤں نے جیسا برا بھلا پکا کر آگے رکہدیا، نکال باہر پہینکدیا، مگر ہم کو جو کچہہ معلوم ہے اس کی بنا پر ہم بآسانی کہتے ہیں کہ اسلام بے ایمان ہے سعید

اگرچہ سیدہی اور بھولی تھی، مگر اس کے انسان ہونے سے تو اسلام کو بھی انکار نہیں،
وہ جانور نہ تھی کہ گھر میں دعوت ہو، اور وہ باورچیخانہ میں جاکر جھانکنے تک نہیں،
آخر یہ بھی سعید کو ارپنہ میں ہی تھی، کہ جاڑوں کے دنوں میں جب تک سوا پہر
دن نہ چڑھ جاتا، وہاں سے باہر نہ نکلتی، اور وہ مجبور تھی کہ عرق النسار کا مرض
بچپن سے اس کی جان کے ساتھ تھا، مگر ہم نے کبھی نہ سنا کہ حمیدا یکدن بھی بھوکا
کچہری گیا ہو، کام کرنے والی بھی دو بچیاں تھیں، یہ صحیح کہ اکیلی سعید نہ کرتی تھی مگر اس
سے کون انکار کر سکتا ہے کہ رشیدہ سے پہلے ہمیشہ سعیدہ باورچیخانہ میں گئی اور اس
نے اپنے ہاتھ سے کھانا لیکر باپ کے سامنے رکھا،

شامی کبابوں میں نمک زہر ہو گیا اور اس نے تین دفعہ کوشش کی، کہ
میاں کو باہر سے بلا کر اس کی اطلاع کردے۔ مگر وہ ایک دفعہ بھی اندر نہ گیا
کھانا جسوقت باہر آیا تو کباب موجود نہ تھے، سعید نے چونکہ دیکھ لیا تھا کہ کباب
تیار ہو رہے ہیں، باہر ہی سے کہلا بھیجا کہ کباب لاؤ، کھانا بہت کافی تھا، اور ایک
کبابوں کے نہ ہونے سے سعید کی ذات میں بٹہ نہ لگتا تھا اگر عقل سے
کام لیتا اور سمجھتا کہ کبابوں کا نہ آنا کیا معنی رکھتا ہے، تو خود ہی معلوم ہو جاتا کہ کوئی
مصلحت ہے لیکن منگائے اصرار سے منگائے، بگڑ کر منگائے تقاضہ سے منگائے
اور اس طرح منگائے کہ سعید مجبور ہوئی، لاچار ہوئی، اور اس کے سوا چارہ نہ تھا
کہ وہی کباب باہر بھیجدیے، اسلام کباب کا ایک ہی ٹکڑا منہ میں آگ بگولا ہو گیا،
اور اسی طرح کھانا چھوڑ چھاڑ گھر میں پہنچا اور بیوی سے کہا،

"یہ کبابوں میں ایسا زہر نمک کیا منہ پہ آنکھیں نہ تھیں"

سعیدہ بیں پلاؤ کی یخنی میں رہی اس کم بخت مغلانی نے قیمہ میں نمک ملا دیا شام
ہوگئی تھی وقت اتنا نہ تھا کہ اور قیمہ منگوا کر بھونا لیتی، اسلیے میں نے نہیں بھیجے تھے،

اسلام: یہ عدد کافی ہے تو اندھی تھی،

سعیدہ ....

اسلام: اب کیا اپنا سر کھاؤں یا تیرا

سعیدہ ....

اسلام: تھوڑی دیر خاموش کھڑا رہا مگر جب کوئی جواب نہ ملا تو اور دو چار باتیں سنا سنو باہر آیا، اور کھانا کھا لیا

اس قسم کے واقعات ایک سعیدہ ہی غریب پر منحصر و موقوف نہ تھے، یوں شہر میں اونٹ بدنام کہنے کو جو چاہے کہہ لو لیکن نمک زہر اور مرچیں ہلاہل گھروں میں ہی ہوتی ہیں غلطیوں کا ارتکاب انسان ہی سے ہوتا ہے اسکے یہ معنی، اور یہ سزا اگر ہماری رائے غلط نہیں تو لاریب اسلام کی زیادتی تھی،

اس قسم کے پے در پے واقعات نے دونوں میاں بیوی میں ایک ایسی دیوار حائل کر دی تھی جسکا توڑنا اب مشکل سے ممکن تھا لیکن ہم ہرگز ہرگز سعیدہ کو مورد الزام نہیں سمجھتے وہ فطرتاً خاموش عورت تھی سیدھی سادی بچی تھی، بھولی بھالی بیوی تھی، اسلام دنیا بھر کی باتیں بگھارتا ہے، ساس پر الزام رکھتا ہے خسر کو مطعون کرتا ہے پر اس کا اپنا کام تھا اور ان حالات میں کہ وہ اس قسم کے خیالات بھی رکھتا تھا تو وہ اچھی طرح تحقیقات کرتا، معلوم کرتا، دریافت کرتا کہ جو لڑکی اس کی بیوی بننے والی ہے جس عورت سے وہ نکاح کرنے والا ہے، اس کی عادتیں اس کی خصلتیں کس قسم کی ہیں، اور اس کی خواہشیں بھی پوری ہوں گی یا نہیں، حمیدہ نے تو نادان کہہ دیا تھا [illegible] نہیں چوری چھپے نہیں کہکر اور صاف صاف کہ لڑکی آج کل کی لڑکیوں کی طرح چالاک نہیں، بھولی بھالی اور خاموش ہے، ان تمام واقعات کو سننے سمجھنے، اور یقین کرنے کے بعد نکاح کرنا خود اسلام کی اپنی عقلمندی ہے،

نکاح کو پہلا سال تھا کہ ایک لڑکا پیدا ہوا دو سال بعد لڑکی اور پانچ سال کے اندر سعید ایک بدنصیب بیوی تین بچوں کی ماں تھی،

خدا کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں، اگر سعید کے ہاں بچے نہ ہوتے تو نہ معلوم کیا مٹی پلید ہوتی، اس حالت میں بھی کہ بچوں والی تھی اور اسلام اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ کبھی صرف پر بھی ایسی خدمت گزار ماما جو اس کے بچوں کی اس طرح پرورش کرے میسر نہیں آ سکتی سعید کی وقعت میاں کی نگاہ میں ماما سے زیادہ نہ تھی،

(۵)

اب ان دونوں میاں بیوی کی زندگی وہ زندگی تھی جس میں بہتر امید کا کوئی شائبہ تک نظر نہ آتا تھا، اسلام قطعاً مایوس ہو چکا تھا، اور زیادہ تر کیا قریب قریب تمام وقت اس کا مردانہ میں بسر ہونا، برائے نام دو چار گھڑی دن رات میں دو ایک مرتبہ گھر میں آیا، دو ایک الٹی سیدھی باتیں کیں، اور چلا گیا، اپنے منہ سے میاں مٹھو بنے کو اسلام جو چاہے سو کہہ لے لیکن اس کا جواب کیا ہے کہ بہتر سے بہتر مٹھائی اچھی سے اچھی ترکاریاں آئیں اور مردانہ میں ختم ہو جائیں، اسلام کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ بیوی اپنے معاملات کی خود ذمہ دار ہیں روپیہ ان کے ہاتھ میں ہے جو چاہیں منگوائیں اور کھائیں، مگر اسلام سعید کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا، اور خوب سمجھتا تھا کہ یہ بدنصیب بیوی اپنے پاس سے آم اور خربوزے تو درکنار چنے تک منگوا کر کھانے والی نہیں،

اب یہ اسلام کی عنایت شرافت جو چاہے سمجھ لو کہ روپیہ پیسہ کے اعتبار سے اس نے بیوی کو کوئی خاص تکلیف نہ پہونچائی، مگر اس سلسلہ میں بھی اسلام کچھ زیادہ تعریف کا مستحق نہیں وہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ بیوی فضول خرچ اور چٹوری نہیں،

حمید اگر سچ پوچھا جائے تو سعید کا عاشق تھا اور یہ بھی نہیں کہ ان دونوں میاں بیوی کے تعلقات سے بے خبر ہو وہ اچھی طرح دیکھ رہا تھا کہ سعید اندر ہی اندر گھل رہی ہے مگر مجبور تھا کہ بیتر ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا اور اب انسداد قطعی ناممکن تھا بیوی سے اس نے البتہ کئی مرتبہ تذکرہ کیا اور صلاح پوچھی مگر وہ کیا رائے دیتی نکاح کے مشورہ میں دونوں میاں بیوی شریک تھے اور اب اسکے سوا چارہ نہ تھا کہ چور کی ماں گھٹنوں میں سر دے اور روئے،

(۶)

عجیب رات تھی وہ جب اسلام غصہ میں لال سب کے سامنے کھڑا بدنصیب سعید پر خفا ہو رہا تھا اور مظلوم بیوی خاموش تھر تھر کانپ رہی تھی،

بات صرف اتنی تھی کہ سعید اپنے چچا زاد بھائی کے نکاح میں شوہر کی اجازت سے گئی، سہ پہر کو جب کسی ضرورت سے اسلام نے اسکا بلانا ضروری اور کسی مصلحت سے اسکا وہاں رات کا رہنا مناسب سمجھا تو یہ پرچہ لکھکر ماما کو دیا

میں نے اس وقت یہ سمجھ کر کہ میرا کوئی حرج نہیں تم کو رات کے رہنے کی اجازت دیدی تھی لیکن بچوں کو وہاں تکلیف ہوگی تم چلی آؤ،

ماما نے یہ پرچہ بجائے سعید کے حمید کے ہاتھ میں دیدیا، حمید کے مزاج سے تو بعید تھا مگر نہ معلوم کیا حرارت آگئی کہ پرچہ دیکھتے ہی، تیور بگڑ گئے اور بیوی کو بلا کر کہا،

آخران زیادتیوں کی کوئی انتہا بھی ہے، یہ غضب دیکھتی ہو کہ ابھی بلا یا ہے،

بیوی، میں کیا بتاؤں

حمید، میں تو نہیں سمجھتا،

بیوی، کیوں معاملہ تم جانتے ہو،

حمید، ضرورت ہے،

بیوی، مصلحت نہیں،

حمید، بس تم خاموش ہو جاؤ،

بیوی، اب تو چلا جانے دو،

حمید، نہیں ہرگز نہیں،

بیوی، پھر کسی موقعہ پر لے کر بینا،

حمید، اس سے بہتر موقعہ اور کیا ہوگا،

بیوی، تمہاری خوشی،

حمید، آخر نکاح کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ بیوی دنیا بھر کے تمام تعلقات منقطع کردے ماں باپ عزیز اقارب سب ہی کچھ حق رکھتے ہیں،

اتنا کہہ کر حمید نے ماما سے کہا جاؤ کہہ دو وہ اس وقت نہیں آسکتیں اور بچوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی، اگر ایسا ہی خیال ہے تو بچوں کو بلا و

ماما اگر حرف بہ حرف اور لفظ بہ لفظ جا کر کہہ دیتی تو بھی مضائقہ نہ تھا اس کم بخت نے ایک کی چار اور چار کی ہزار جڑیں اور لگائیں، اب اسلام کو تاب کہاں تھی اور یہ عمر بھر میں پہلا اتفاق تھا کہ بیوی نے نا فرمانی کی جوانی کا نشہ، دولت کا نشہ، وکالت کا نشہ تینوں زور موجود تھے، فوراً ڈولی بھیجی اور یہ پرچہ لکھا،

اگر تم اسی وقت نہ آئیں تو میں خود آتا ہوں، یاد رکھو کوئی طاقت میرا ہاتھ نہیں روک سکتی،

سعید پہلے پرچہ پر حواس باختہ ہو چکی تھی، اور ماں سے کہہ رہی تھی کہ خدا کے واسطے ڈولی منگوا کر بھیجدو، ابا جان کو سمجھاؤ کہ مرنا اور بھرنا اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے، یہ پرچہ پہنچا تو ماما کم بخت نے آگ لگانے کو یہ بھی حمید ہی کے ہاتھ

میں دیا، اور اس نے پرچہ پڑھکر بیوی سے کہا اب کہو،

بیوی میں تو شروع ہی سے کہہ رہی ہوں کہ بھیجدو،

حمید، ذرا کڑی ہو،

بیوی، بہتر یہی ہے کہ بھیجدو

حمید، وہ کر کیا سکتا ہے،

بیوی، نہ کر سکے،

حمید، ڈر کس بات کا ہے

بیوی کسی بات کا نہیں

حمید، پھر کیوں بھیجدو،

بیوی، اس وقت تو بھیجدو میں پھر تم سے بحث کرونگی، یہاں شادی کا موقع ہے کیوں دوسروں کو بھی اپنی وجہ سے بے مزہ کیا،

حمید، تم بیچمے سے پوچھو یہ کیا کہتی ہے،

بیوی، اس سے کیا پوچھوں بس جانے دو،

حمید، نہیں اس سے دریافت کرو،

بیوی، کرلیا،

حمید، کیا کہتی ہے،

بیوی، یہی جو میں کہہ رہی ہوں،

حمید، وہ بھی جانا چاہتی ہے،

بیوی، تمہیں سے بات پوچھتے ہو بات کی جڑ اپنی تکلیف سے دوسروں کو پریشان کرنا تو اللہ نے بتایا ہے،

حمید، وہ بھی تو غیر نہیں ہیں،

پہوپی، نہ سہی تم ہٹو میں لڑکی کو ڈولی میں بٹھاؤں،

حمید، میرے سامنے اس کو بلاؤ میں خود پوچھوں

پہوپی، کیا ہو گیا بس جانے دو،

حمیدہ، خیر تمہاری خوشی،

غالباً رات کے نو بجے ہوں گے، جب سعید کی ڈولی گھر میں آ کر اتری، وہ میاں کے غصہ اور فضیحتوں کی تو شروع ہی سے عادی تھی، مگر جو مصیبت اس نے آج دیکھی کہ ہاتھ میں بید چہرہ سُرخ منہ سے جھاگ وہ اس سے پہلے نہ دیکھی کانپ گئی، گردن جھکائے خاموش کھڑی تھی، اسلام نے ایک بات کی ہو تو بیان کی جائے، بوچھاڑ تھی کہ کسی طرح ختم ہی نہ ہوتی تھی ایک موقعہ پر چند لمحہ خاموش رہ کر اسلام آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا کہ میں دیوانہ ہوں یا کتا جو مجھے بھونکا رکھا ہے، اب بولتی کیوں نہیں، میں بھی تو سنوں کہ کیا کہہ رہی تھی

سعیدہ............................

جب کسی طرح کوئی جواب نہ ملا تو اسلام نے بید اٹھائی اور کہا نمک حرام تو پٹ کر بولے گی،

اس وقت سعید کے دل کی عجیب کیفیت تھی، وہ پٹنے کا یقین کر چکی تھی، اور سمجھ رہی تھی کہ جس جسم کو کبھی ماں باپ نے پھول کی چھڑی بھی نہیں لگائی آج اس پر بید پڑیں، اس کی نگاہ نیچی تھی اس کی زبان خاموش تھی، اور اسلام برابر اسی طرح آگ بگولا ہو رہا تھا، یہاں تک کہ گود کی بچی گھبرا اٹھی، اور رونا شروع کیا، سعید کی کیفیت اس وقت صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، وہ ہر لمحہ جو مار سے محفوظ تھا غنیمت سمجھ رہی تھی چاہا کہ بچی کو جا کر اٹھا لاؤں، مگر جب کی کیفیت یہ تھی

کہ ایک قدم نہ سرکا سکی اور دل نے کہا کہ اگر ذرا بھی ہلی اور سعید پڑی،

بچی روئی تو اس غضب کا سلسلہ شروع تھا کہ ایک دس منٹ کے عرصہ میں چاروں بچے جاگ اٹھے، اور اب اسکے سوا اسلام کو یارا نہ تھا کہ وہ سب کو چھوڑ چھاڑ گھر سے باہر نکلے، چلا مگر چلتی دفعہ یہ کہتا گیا،

تقدیر ہی اچھی تھی جو اس وقت بچ گئی، ورنہ میں تو قصد کر چکا تھا کہ پوری سزا دوں،

میاں باہر گیا تو بیوی بدنصیب کی جان میں جان آئی بچی کو اٹھایا گود میں لیا دودھ پلایا، اور الگ کونہ میں بیٹھ اپنی تقدیر کو رونے لگی،

جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس قسم کے واقعات سے اسلام اور سعید کی زندگی کا کوئی ہفتہ خالی نہیں تعجب یہ تھا کہ باوجود ناامید ہو جانے کے اسلام کی زندگی کیا معنی رکھتی تھی، شادی کا چھٹا سال تھا اور سعید کو چھ سات مہینہ کا حمل کہ بیمار پڑی ہم کو اس کے ابھی تک تندرست رہنے پر تعجب تھا، وہ اسلام سے اور اسکے ساتھ ہی اپنی آئندہ زندگی سے قطعاً مایوس ہو چکی تھی، اور اب اس منزل میں منزل مقصود پر پہنچنے کا سان گمان بھی نہ تھا، یہ یقین اس کی حالت چلتی روی کرتا و جب تھا، مگر خدا معلوم کیسی بے غیرت تھی وہ خود اور اس کی زندگی کہ دنیا کو موت آرہی تھی لیکن اس کی تقدیر کی موت نہ تھی، کہ اس مصیبت سے چھوٹ کر اطمینان کی نیند سوتی، خدا خدا کر کے اس حمل نے اپنا رنگ دکھایا، اور وہ بخار جس نے اندر ہی اندر کلیجہ برباد کیا تھا پھوٹ پڑا کھانسی شروع ہوئی، بخار آیا، اور کھانسی بخار گیا نہ ہی دست یہ وہ حالت تھی کہ حمید اور اس کی بیوی دونو ماں باپ تڑپ اٹھے مگر ہم دونو کو مرحبا کہتے ہیں کہ کبھی بھول کر بھی ایک لمحہ کے واسطے ان کے دل میں یہ خیال تک پیدا ہوا کہ بیٹی کو اپنے گھر بلا لیں، شادی کے موقعہ پر محض ایک پرچہ نے جو گل کھلایا

دونواس سے اچھی طرح باخبر تھے اور غالباً یہ ہی وجہ تھی کہ زبان پر نہ لائے، اسلام اس اعتبار سے اگر تعریف کا مستحق ہے تو ہوگا کہ اس نے ایک چھوڑ دو دو ڈاکٹر بلاکر مریضہ کی کیفیت بیان کردی، اوران کا علاج شروع کردیا لیکن اس سلسلہ میں یہ کبھی نہیں ہوا، کہ وہ تھوڑی دیر کے واسطے بیوی کے پاس جاتا اور اس کی خیریت معلوم کرتا گھر میں جانا اول یوں ہی برائے نام تھا، اور جب سے بیماری کا سلسلہ شروع ہوا تو اس نے اندر کی آمد و رفت قطعاً بند کردی مہینہ بھر کے قریب ڈاکٹروں کا علاج ہوتا رہا مگر بڑا مرض اندر ہی اندر گھو کھلا کر رہا تھا مطلق افاقہ نہ ہوا اور بالآخر مظلوم سعید کے پاؤں پر ورم آگیا، ڈاکٹر اور حکیم تو کیا بچہ بھی سمجھ سکتا تھا کہ اب صحت کی ہر اُمید منقطع ہوگئی، آج البتہ ڈاکٹروں نے جواب دیدیا اور صاف کہا کہ اب دوا وغیرہ بند کرو،

گرمی تڑاقے کی تو نہیں مگر ہاں شروع ہوچکی تھی، یہ سنتے ہی کہ اب بچنے کی کوئی اُمید نہیں، اسلام نے پہاڑ کا قصد کیا، اور اسباب وغیرہ باندھنا شروع کیا رفتہ رفتہ یہ خبر سعید کے کان میں بھی پہونچی، اس نے دو دفعہ ماما کو بھیجا تین چار مرتبہ بڑے لڑکے سے کہلوایا کہ ایک دفعہ مجھے اپنی صورت دکھاتے جاؤ مگر جب اسلام نے مطلق توجہ نہ کی، اور جواب تک نہ دیا تو اسی حالت میں گرتی پڑتی اٹھی اور یہ پرچہ لکھا،

زندگی امید نہیں، صرف ایک دفعہ صورت دکھادو، اور قصور معاف کردو،

ہم نہیں جانتے اسلام کے متعلق کیا رائے قائم کریں، اس نے اس انسان کی التجا جو موت کے منہ میں تھا بیدردی سے ٹھکرادی، اور وہ بھر سپردانہ کی اور رات کو روانہ ہوگیا،

بیمار سعید جس کی آنکھیں دروازہ کو تک رہی تھیں، یہ سنتے ہی کہ روانہ ہو گئے بیہوش ہو گئی
اور قریب قریب گھنٹہ بھر تک بیہوش پڑی رہی،

یوں تو دنیا میں ایک سے ایک زیادہ تعجب انگیز واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور
شب و روز ایسی ایسی باتیں ہو رہی ہیں جن کا سان گمان تک نہیں ہوتا، مگر یہ واقعہ بھی
بجائے خود کچھ کم حیرت نہیں رکھتا کہ جس سعید کو حکیم اور ڈاکٹر کیا دنیا جواب دے چکی تھی
اس کے ہاں نواں مہینہ شروع ہوتے ہی بچہ ہوا،

بچہ پیدا ہوا اور بچہ کی پیدائش کیا حشر کا کام تھا، اور بیماری کی یہ حالت تھی
کہ بچہ پیدا ہوتے ہی سعید بالکل چنگی بھلی تھی، اسلام جس وقت [illegible]
کے بعد کے تھے سب کر گیا تھا، اور اطمینان سے پہاڑ کے مزے [illegible]
بچہ پیدا ہوا اور ایسا بھاگوان کہ مردہ ماں کو زندہ کر دیا،

صحت کے خط اس کے پاس پہنچے، وہ تعجب کرتا کہ معاملہ کیا ہے، کبھی وہ اس
اپنے کو جادو سمجھا، کبھی خطوں کو غلط خیال کیا، کبھی چکر میں پڑتا، غرض کبھی بیوی کی صحت
کا یقین ہوتا، کبھی موت کا،

رات کے نو بجے ہوں گے کہ اسلام گھر میں آ کر اترا اور رفع حیرت کے واسطے
اترتے ہی اندر پہونچا تو کیا دیکھتا ہے چاندنی رات میں سعید چاند سے لال کو گود
میں لئے اطمینان سے بیٹھی ماما سے باتیں کر رہی ہے، الٹے پاؤں واپس آیا، اور یہ
کہہ کر بیٹھ گیا،

"جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے"

(۷)

گرمی زور شور سے پڑ رہی تھی اور گو جولائی کا مہینہ بھی ختم کے قریب تھا، مگر
آسمان پر ابر کا دھبہ تک نظر نہ آتا تھا، شام کے وقت ایک روز اسلام کچہری سے

آرہا تھا راستہ میں لکھنؤ کے خربوزے پک رہے تھے اور ایسے شیریں کہ قند کو پرے بٹھائیں، اسلام ان کی تعریف سن چکا تھا، پانسیر لیکر گاڑی میں رکھ لیے کھانے کے وقت پیٹ بھر کر کھائے، مگر نہ معلوم ان میں کوئی خاصیت تھی گرمی تھی کوئی تاثیر تھی، کھلنے میں کچھ اثر تھا کہ اوہر تو ہاتھ نہ دھوئے، اور اُدہر بخار چڑہا، اسلام بیماری کا اسقدر کچا اور ڈرپوک تھا کہ سر کا درد اور درد بھی معمولی اس کے ہوش باختہ کر دیتا تھا، یہ بے موسم کا اور دفعۃً بخار ایسا نہ تھا کہ اسلام خاموش ہو جاتا اسی وقت ڈاکٹر کو بلایا، خود مردانہ میں آکر پلنگ پر لیٹا، چادر اوڑہا، مگر سردی ایسی چڑہی کہ تلے تین چار چار لحافوں پر بھی نہ تھمی، ڈاکٹر آیا تو بخار ۱۰۴ سے زیادہ تہا دو رات اسی طرح پڑا رہا تیسرے روز سعید پردہ کر مردانہ میں آئی اور بہ منت کہا کہ اندر چلے چلو، اسلام کیا جانے والا تہا، بگڑنے لگا، مگر سعید نے صاف کہدیا کہ اگر تم اندر نہیں چلتے تو میں یہاں تنہا چھوڑکر نہ جاؤں گی، ہرچند اسلام نے اپنی طرف سے خفگی اور غصہ میں کسر نہ چھوڑی، مگر وہ ایک قدم وہاں سے نہ سرکی اس حالت میں مجبور مردانہ سے اٹھہ اندر زنانہ میں آیا، بخار لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہا تہا اور حالت ساعت بہ ساعت ردی، ابتدا میں تو چند دوست اور آشنا خیر صلاح کو آتے جاتے رہے مگر مرض نے جتنی جتنی بدتری کی صورت اختیار کی اتنی اتنی ان لوگوں کی آمد رفت میں بھی کمی ہوئی، حتیٰ کہ وہ ہر وقت کے لنگوٹیے جو دم بھر کو پیچھا نہ چھوڑتے تھے اور بڑے لمبے لمبے دعوے کرتے رہتے تھے ہی برائے نام رہ گئے، یہ وہ دوست تھے جنکا بڑا مقصد صرف ہاں میں ہاں ملانا تھا اور جب کبھی اسلام نے ان کے سامنے بیوی کی شکایت کی تو نہ صرف اس کی حالت پر افسوس ہی کرکے خاموش ہو گئے بلکہ یہ بھی کہا کہ ایسی بیوی کو بھرنا اور نالائق عورت سے شریفانہ برتاؤ کرنا آپ ہی جیسے شریف انسان کا کام ہے شاباش یہی وجہ ہوگی کہ اسلام ہمیشہ اپنے متعلق یہ

تحمل کرتا رہا کہ اگر میرے سواے کوئی دوسرا شوہر ہوتا تو ایسی بیوی کی صورت تک نہ دیکھتا،
بیماری کی حالت میں اسلام کا اندر آنا مجبوری کھلی ہوئی تھی کچھ اسلیئے نہیں کہ
بیوی نے یہ کہدیا تھا کہ اگر تم اندر نہ چلے گئے تو میں یہاں سے ایک قدم نہ سرکوں گی بلکہ
اس لیے کہ ابتدائی دورات میں نہایت تکلیف اور پریشانی میں گزریں وہ چار دن پانچوں
دوست جو رات کے بارہ بارہ اور ایک ایک بجے تک ہنستے بولتے رہتے تھے آنکھ
جھپکتے ہی وبے پاؤں سیدھے ہو لیے، نوکر گھنٹہ دو گھنٹہ اور جاگ سے، اسلام کی
آنکھ کھلی تو کوئی اتنا بھی نہ تھا کہ دو قطرے پانی کے پلا دیتا، دوسری رات اس سے بھی
زیادہ مصیبت کی تھی کہ پانی تو پانی کوئی بات تک پوچھنے والا نہ تھا ان حالات میں
اسلام اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اگر بیوی نہیں تو گھر کی مامائیں ہی رحم کھا کر مجھ کو پانی
وغیرہ پلادیں گی، اور اگر کچھ اور نہیں تو تنہائی میں جی تو نہ گھبرائے گا گھر میں آیا تو اسنے
وہ کیفیت دیکھی کہ دنگ رہ گیا جس عورت کو پتھر اور جس بیوی کو جانور سمجھتا تھا وہ تو
ہیرے کو مات کر رہی تھی کیسے نوکر اور کس کی مامائیں، سعیدن دامون کی لونڈی تھی
اس کو رونے اور گڑگڑانے کے سوا کوئی کام ہی نہ تھا، یا میاں کی خدمت میں مصروف
ہے یا خدا کی عبادت میں، یہ عبادت اپنے واسطے نہیں صرف میاں کی صحت کیلئے
سجدے میں پڑی ہے رو رہی ہے بلبلا رہی ہے، اور گڑگڑا رہی ہے سب سے زیادہ تعجب انگیز
معاملہ جس نے حالات سے زیادہ اسلام کو پریشان اور متعجب کر دیا سعید کا یہ جادو تھا
کہ متواتر سات روز ایک لمحہ کو ایسا نہ ہوا کہ اسلام نے آنکھ کھولی ہو اور بیوی کو آرام کرتے
یا دم لیتے دیکھا ہو، سات دن اور سات رات کا جاگنا آسان بات اور معمولی کام نہیں
نیند وہ جادو ہے جس کے اثر سے پھانسی تک پر آدمی محفوظ نہیں رہ سکتا، مگر قیاس میں
نہیں آتا کہ سعید کی نیند کہاں اڑ اور کدھر سٹ گئی، وہ ایسی اڑی رہتی تھی کہ آنکھ مچنے
اور پلک جھپکنے کا نام بھی نہ لیتی تھی، اسلام بیمار تھا مگر اس کا دماغ بیمار نہ تھا وہ سمجھ رہا تھا

اور سمجھ رہا تھا کہ بیوی کیا چیز ہی، اور جس عورت کو میں مصیبت سمجھ رہا تھا وہ کچھ وقعت رکھتی ہے، پھر یہ بھی نہیں کہ اسلام کے خوش کرنے یا دنیا کے دکھانے کو آدھی رات کا وقت ہی بلکہ پچھلا پہر اسلام بخار میں لوتھڑا ہوا ہے، اتفاق سے آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہے کہ بیوی سجدے میں سر رکھے خدا کے حضور میں گڑگڑا رہی ہے، اور رو رو کر اس کی صحت کے واسطے دعائیں مانگ رہی ہے،

علاج ڈاکٹری تھا اور دوائیں تین تین گھنٹہ بعد دی جاتی تھی، دن تو خیر جس طرح ہوتا گذر جاتا، مگر رات کو البتہ وقت تھی، لیکن سعیدہ کے استقلال نے اس وقت کو قطعاً محسوس نہ ہونے دیا، اس نے مریض کی پٹی دم بھر کو نہ چھوڑی ساری رات آنکھوں میں کٹتی، بچہ بچہ پڑ کر سو جاتا، اور وہ خاموش بیٹھی اس کے چہرہ کو دیکھتی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑیاں برستیں، دل سے طوفان قیامت اٹھتا، اس حالت میں نیند کیسی اور سکون کس کا دل کو ایسی لگی تھی کہ وقت مقررہ پر ایک لمحہ کا ٹلنا مشکل تھا، یہ تمام کیفیت اسلام نے روزمرہ اپنی آنکھوں سے دیکھی، اور اب اس کو معلوم ہوا کہ بیوی کیا چیز ہے، اور جن دوستوں اور عزیزوں نے اب تک یاڑ پر رکھا، وہ فقط لطف اٹھانے اور مزے لوٹنے والے تھے، اب اسلام کے سامنے وہ موقعہ آیا کہ سعیدہ بیمار تھی اور ایسی بیمار کہ جینے کی کوئی امید نہیں اور میں اس حالت میں اسکو چھوڑ چھاڑ پہاڑ پر چلا گیا تھا، یہ ہی نہیں بلکہ اس حالت میں بھی جب اس نے میرے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی میں نے اس کا معصوم جذبہ جس میں خلوص کے سوا کچھ نہ تھا بیدردی سے ٹھکرا دیا، اور زندہ بیوی کو اپنی طرف سے مردہ سمجھ بے فکر ہو بیٹھا،

اس قسم کے تخیلات اکثر اسلام کے دماغ میں چکر لگاتے، اس نے ابھی تک زبان سے کچھ نہ کہا، مگر اس کا دل اس کا دماغ یہ سماں دیکھ رہا تھا اور وہ دل اپنی بیدردی پر لعنت بھیج رہا تھا، مزاج کی سختی اور بات کی پچ اسے اجازت

تہی کہ وہ اب بہی کہ موت سامنے تہی بیوی کے سامنے اپنی غلطی کا اقرار اور لغزش کا اعتراف کرے اس کے دل میں اب یہ خیال پیدا ضرور ہوے لگا تہا کہ سعید حق رکہتی ہے کہ میں اُسکے پاؤں دہو دہو کر پیوں، اور میں یقیناً سزاوار ہوں کہ اگر اتنی قدرت نہیں رکہتی تو خدا کی زبردست طاقت سعید کا بدلہ مجہہ سے لے ان ہی حالات میں اس کا دل اور دماغ دو نوچکر کہا رہے تھے کہ ایک روز اس نے دیکہا کہ سعید اپنے ہاتہہ سے اس کا اگالدان صاف کر رہی ہے، یہ ایسا معاملہ نہ تہا کہ اسلام خاموشی سے دیکھکر ٹالدیتا سعید کا یہ فعل ایسا تہا کہ اسلام کے ہوش اڑ گئے، اور اب تک جس ضبط کی قوت سے وہ کام لے رہا تہا وہ کمزور ہوئی اور سعید سے کہنے لگا،

"کیا کرتی ہو بیگم یہ تمہارا کام نہیں"

سعید، کیوں، میرا کام کیوں نہیں،

اسلام، ماما ئیں موجود ہیں،

سعید، میں کیا ماما نہیں ہوں،

اسلام، توبہ توبہ ماما سے کہو وہ صاف کرے گی،

سعید، دو دفعہ کہہ چکی ہوں نہیں کرتیں،

اسلام، بڑی بی سے کہو،

سعید، انہوں نے بہی جواب دیدیا،

اسلام، یہ تمہارا کام نہیں تم غضب کر رہی ہو،

سعید، بیشک میرا کام ہے، میں گہر کی بیگم ہوں اور تمہاری لونڈی،

بخار نے اسلام کو اس قدر کمزور کر دیا تہا، کہ وہ اتنی گفتگو بہی مشکل سے کر سکا سعید کا آخری فقرہ اس قدر موثر تہا کہ اسلام کانپ گیا، وہ چاہتا کہ بیوی کے ان ہاتھوں کو جن سے اگالدان صاف کر رہی تہی آنکہوں پر رکہہ لوں، مگر ہمت

نہ پڑتی تھی اس کی آنکھ سے آنسو نکل پڑے اور لب سے صرف اتنا کہا

"دین و دنیا دونوں میں خوش رہو"

سعید نے میاں کی یہ کیفیت دیکھی اس کی آنکھ سے آنسو نکلتے ہی وہ بے چین ہوگئی

ہاتھ دھوئے، میاں کے قریب آئی اور کہا،

تم اپنا دل کیوں کڑھا رہے ہو،

اسلام، نہیں میں اپنی پچھلی حرکتوں پر نادم ہوں،

سعید، کوئی غلطی نہیں

اسلام، تم مجھ سے ناخوش ہو،

سعید، مطلق نہیں،

اسلام، کہدینے سے کیا ہوتا ہے، میں خود سمجھتا ہوں،

سعید، میں خدا کو گواہ کرکے کہتی ہوں کہ ناخوش نہیں،

اس گفتگو نے اسلام کی حالت پر اور زیادہ اثر کیا وہ خاموش ہوگیا اور اس آخری فقرہ کا کچھ جواب نہ دیا، مگر اس کی آنکھوں سے مسلسل لڑیاں بہہ رہی تھیں،

(۸)

اسلام کی حالت روز بروز ردی ہو رہی تھی، علاج میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا گیا، تیمارداری ایسی ہوئی کہ بہت کم مریضوں کو میسر ہوتی ہے، مگر دماغ کچھ ایسا کمزور ہوگیا تھا کہ بعض دفعہ اس کی باتیں بالکل بے تکی ہوجاتی تھیں، گیارھواں روز تھا اور بخار بدستور کہ دماغ زیادہ خراب ہوا، اور کامل دو گھنٹہ تک بہکی بہکی باتیں کرنے لگا، یہ حالت دیکھ کر سعید اور زیادہ مضطرب ہوئی، مگر اس کے سوا کر ہی کیا سکتی تھی کہ روئے، بلبلائے، اور گڑگڑائے، سہ پہر کے وقت ذرا اسلام کی حالت سنبھلی، دماغ کی کیفیت میں جس قدر فرق تھا، اگر بخار میں بھی اتنا ہوجاتا تو

بہت اچھا تہا لیکن دماغ صحیح ضرور ہوگیا، مگر بخار میں کسی طرح کا فرق نہ تہا ڈاکٹروں کا خیال تہا کہ ساتویں روز اتر جائے گا، وہ سات روز گذر گئے، پھر آٹھہ روز کا میعادی ہوا، وہ بھی نہ اترا، اب اکیس روز کی رائے تھی، مگر بارہویں روز وہ مانے والے سب رکھی کی رکھی رہ گئی، اور اب اسلام کو سرسام ہوا،

اس وقت دماغ بالکل بیکار تہا، نہ وہ سمجھہ سکتا تہا کہ کیا ہو رہا ہے نہ کہہ سکتا تہا، کہ کیا کرو، زبان البتہ کام کر رہی تھی اور بہ ظاہر آنکھیں بھی کھلی ہوئی تھیں، مگر جو فقرہ زبان سے نکلتا تہا وہ اوندہا، سعید سوال کرتی تھی، مگر کسی بات کا جواب ٹھیک نہ ملتا تہا، دو روز یہ کیفیت طاری رہی، اور تیسرے روز زبان بھی بند ہوگئی، اب البتہ سعید کے ہوش اڑ گئے، اور اس کو شوہر کی طرف سے بالکل مایوسی ہوگئی، چار روز اسی حالت میں بسر ہوئے اور پانچویں روز اسلام کی موت نے بدنصیب سعید کو بیوگی کا برقع اڑہا دیا،

(۹)

اس انقلاب نے سعید کی حالت پر کیا اثر کیا اس کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ رات دن وہ تھی اور رونا، تینوں بچے ساتھہ تھے بڑا لڑکا حاتم آٹھویں سال میں منجھلی لڑکی شمسہ پانچویں اور چھوٹا بچہ انعام تیسرے سال میں، ان تین بچوں کی پرورش بہ ظاہر سعید کے دل بہلاؤ کا اچھا مشغلہ تہا، مگر بدبخت اسلام (خدا غریق رحمت کرے) جہاں دل کا کٹھن تہا وہاں طبیعت کا بھی اتنا غنی کہ کبھی اپنی کوئی ضرورت اٹکی نہ رہنے دی، جائداد بکے ہزار کا مال سو کو جائے، مگر ضرورت پوری ہو اس نے اپنی عمر میں کبھی کسی کے آگے ہاتہہ نہ پہیلایا کسی کا احسان قطعی نہ اٹھایا لیکن زندہ رہتا تو تعجب نہیں کہ وقت اس کے سب بل نکال دیتا اور ہزار کیا ہزاروں بلکہ ایک پیسہ کے واسطے اسکو دوسرے کا زیر بار احسان ہونا پڑتا، مرا تو صرف بارہ ہزار کو وہ

دکان [illegible] ہزار بدلے رہن، اور دو سال کا سود چڑھا ہوا سعید بیوہ ہوئی تو سوا اس زیور کے جو اس کی اپنی ملکیت اور میکے کا جہیز تہا، باقی ایک کوڑی بہی اس کے پاس نہ تہی، رہنے کا مکان با وجود اس طمطراق اور دہوم دہام کے کرایہ کا تہا، اور کرایہ بہی معمولی نہیں چالیس روپیہ ماہوار اب سعید کا اس میں رہنا اور کرایہ ادا کرنا بہت مشکل تہا یہ بہی غنیمت تہا کہ ما اور باپ دونوں زندہ تھے ورنہ اور مٹی پلید ہوتی مکان چہوڑ بچوں کو ساتھ لے میکے میں آئی، مگر اتفاق یہ ہوا کہ شوہر کو مرے شاید چوتھا مہینہ تہا کہ ما بہی دنیا سے رخصت ہوئی،

سعید کا باپ اسوقت بہوٹس تو نہیں مگر خاصا بڈہا آدمی تہا اور ہر شخص کو اس کی موت سامنے دکھائی دے رہی تہی، اگر وقت نے اس کی عقل پر ایسے پردے ڈال دئے تھے کہ وہ خود اندہا تھا، اور اس چیز کو جو ہر آنکھ دیکھ سکتی تہی، وہ مطلق نہ دیکھ سکتا تہا، دوسرے نکاح کا قصد تھا، مگر اس قصد کی تکمیل میں سب سے بڑی وجہ سعید کی موجودگی حایل تہی اور یہ موجودگی اس وقت تک رفع نہ ہو سکتی تہی جب تک کہ سعید کا نکاح ثانی نہ ہو یا وہ مر نہ جائے، موت سعید کے اپنے بس کی تہی نہ باپ کی، اب لے دے کر ایک نکاح ثانی رہ گیا، یہ بہی آسانی سے ممکن نہ تہا، گو سعید باعتبار عمر ضرور یہ حق رکہتی تہی کہ اسکا نکاح کر دیا جائے، مگر ایک نہیں تین تین بچے ساتھ تھے اور ان کی پرورش میں ایک غیر شخص کی شرکت مشکل سے ممکن تہی،

باپ اپنے نکاح کے واسطے اس قدر بیتاب تہا کہ اگر اس کا بس چلتا تو کسی رستہ چلتے سے نکاح کر بیٹی کا پاپ کاٹتا، مگر بڑی خرابی یہ تہی کہ اس معاملہ کے متعلق اس کو بیٹی کے خیالات کا مطلق علم نہ تہا، گھر میں کوئی عورت اس قابل نہ تہی کہ اس کے خیالات کا اندازہ کر سکتی اس لئے مجبوراً ایک روز خود ہی اس نے بیٹی سے اس طرح گفتگو کی،

کیا کروں تم پر جو مصیبت آ پڑی ہے اس کا اندازہ [illegible] ہو سکتا ہے میں ہر وقت
سوچتا ہوں کہ کوئی اللہ کا بندہ ایسا مل جائے جو غریب بھی ہو اور اگر زیادہ نہیں
تو اتنا ہی کہ اپنا اور تمہارا پیٹ بھر سکے، مگر وقت اتنا نازک ہے کہ کوا یوں ہی کوئی
نہیں پوچھتا،

سعید باپ کی یہ گفتگو سنکر سناٹے میں رہ گئی اس کے وہم و گمان میں بھی یہ
بات نہیں آ سکتی تھی کہ مجھے دنیا میں اب پھر بیوی بننا ہے، اس لئے ایک نظر
باپ کے چہرے پر ڈالی اور خاموش ہو گئی،

باپ کا مقصد اس گفتگو سے صرف بات کان میں ڈالنی تھی وہ ہو گیا، اور وہ
اپنے دل میں نہایت شاد و بشاشش باہر چلا گیا، اور یہ فیصلہ کر چکا کہ بہت
جلد اس کا نکاح کر دونگا،

سعید باپ کے جانے کے بعد گم سم کھڑی کی کھڑی رہ گئی اس کا بس
چلتا تو زمین میں گڑ جاتی، باپ چلا گیا مگر وہ گھنٹوں بیٹھی روتی رہی، سوچتی رہی کہ
آخر اب کیا کروں، یہ منہ اب اس قابل نہیں کہ باپ کو دکھا سکوں، دن بھر کونہ میں
پڑی روئی، اور کوئی صورت کامیابی کی نظر نہ آئی، میکہ اور سسرال ننھیال
اور ددھیال جدھر نظر ڈالتی تھی ایک متنفس بھی ایسا نظر نہ آتا تھا کہ اس مصیبت
میں مدد دیتا اور بدنصیب کا ہاتھ بٹاتا، سوچتے سوچتے خیال آیا کہ اماں کی خالہ زاد
بہن خالہ کلثوم بیگم البتہ زندہ ہیں، وہ شاید کچھ مدد دے سکیں، ڈوبتے کو
تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے، خالہ کلثوم کا خیال آتے ہی قلب کی گرتی ہوئی دیوار
کو ایک اڑواڑ لگ گئی، اور ارادہ کیا کہ ڈولی منگوا ان کے پاس پہنچوں، اٹھی اور
بڑے رشکے سے کہا جاؤ ڈولی لا دو، مگر ابھی لڑکا نکلا ہی نہ تھا کہ آگے آگے باپ
اور پیچھے پیچھے خالہ کلثوم چلے آرہے ہیں،

خالہ کو دیکھکر سعید کی جان میں جان آگئی، اس کم بخت کو کیا معلوم کہ باپ نے ایسا سمجھا بجھا دیا ہے کہ اب اس پر سعید کا کوئی منتر کارگر نہیں ہو سکیگا، باپ تو آنکھ بچا کر باہر گیا، اور خالہ نے کہا،

بیٹی تم خاموش کیوں ہوگئیں، آخر نکاح تو کرنا ہی ہے، ابھی عمر ہی کیا ہے باپ کی آنکھ بند ہوگئی تو کس کی دہلیز پر بیٹھو گی،

سعید، خدا کے واسطے میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکئے،

خالہ، اے بیٹی سب یوں ہی کہا کرتے ہیں،

سعید، جی نہیں میں سچ عرض کرتی ہوں،

خالہ، لڑکی عقل کے ناخن لے، بچوں کا ساتھ، خالی ہاتھ، جوان عمر نکاح نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا،

سعید، بھیک مانگوں گی، سلائی کروں گی، پسائی پیسوں گی،

خالہ، ارے بیوی ان باتوں میں کیا رکھا ہے،

سعید، جب میں خود رضا مند نہیں تو کوئی زبردستی ہے،

خالہ، تو کیا ہم دشمن ہیں؟

سعید، ہاں یہ تو دشمنی ہے،

خالہ، یہ دشمنی نہیں دوستی ہے،

سعید، مجھے ایسی دوستی کی ضرورت نہیں،

خالہ، ایسا کونسا کٹر باپ ہوگا جو جان بوجھ کر اولاد کو مصیبت میں چھوڑ جائے،

سعید، خالہ اماں آپ کیا فرما رہی ہیں،

خالہ، درست کہہ رہی ہوں، ٹھیک کہہ رہی ہوں،

سعید، خالہ جان للہ رحم کیجئے،

خالہ، سعیدہ تم دیوانی ہو،

سعیدہ، آپ مجھے دیوانہ ہی سمجھیے،

خالہ، میں تمہاری دشمن نہیں ہوں،

سعیدہ، عرض تو کر رہی ہوں معاف کیجیے،

خالہ، سمجھو تو سہی، ان بچوں کو کہاں سے پالو گی

سعیدہ، عرض تو کر چکی کہ سلائی سیلوں گی، بھیک مانگوں گی،

خالہ، باپ دادا کی ناک کاٹو گی،

سعیدہ، جو کچھ ہی ہو مگر نکاح نہ کروں گی،

خالہ، نکاح کرنا پڑے گا،

سعیدہ، جی نہیں ہرگز نہ ہوگا،

خالہ، ہوگا کیسے نہیں،

سعیدہ، زہر کھاؤں گی،

خالہ، بچوں کا کیا حشر ہوگا،

سعیدہ، ان کا صبر آپ پر پڑے گا،

خالہ، نکاح ایسی بُری چیز ہے، پھر پہلا کیوں کیا،

سعیدہ، اس وقت دنیا کرتی ہے،

خالہ، ہاں تو اب بھی دنیا کرتی ہے،

سعیدہ، خالہ جان ان باتوں سے کیا فائدہ،

خالہ، بیٹی تو کچھ سمجھ نہیں سکتی،

سعیدہ، جی نہیں، میں سب سمجھتی ہوں،

خالہ، جس سے ننگی بُڑھیا ننگی پھرے، یہ تو ٹھیکرا لیکر مانگی بھیک،

سعیدہ، للہ خالہ جان مجھ پر رحم کیجئے،

خالہ، بیٹی تو ہی اپنی حالت پر رحم کر،

سعیدہ، ہائے اللہ میں کیا کروں،

خالہ، بیوی خود ہی سمجھ کچا ساتھ خالی ہاتھ یہ عمر گزریگی کیونکر

سعیدہ ....

خالہ، ایک وارث تو سر پر کھڑا ہو جائے گا،

سعیدہ ....

خالہ، باپ کا کیا ہے وہ تو پکے پان ہیں، ان کا کیا بھروسہ،

سعیدہ، میری تو عقل کام نہیں کرتی،

خالہ، دوسروں کی عقل سے کام لو، ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں،

سعیدہ، جی نہیں دشمن تو میں ہی نہیں سمجھتی،

خالہ، پھر ہم بہتر ہی سمجھ رہے ہیں، جو کچھ کہہ رہے ہیں،

باپ جواب تک خاموش کھڑا بیٹی کا غصہ تحمل سے ڈیوڑھی میں کھڑا سن رہا تھا یہ دیکھکر کہ اس قدر بحث اور گفتگو کے بعد سعید ذرا ہلکی پڑی مطمئن ہوا، اور آگے بڑھ کر سامنے آیا اور کہنے لگا،

بھلا یوں آپ خود خیال کیجئے کیسی بیوقوف لڑکی ہے ہم اس کے دشمن ہیں جو اس کے ساتھ برا سلوک کریں گے، موقعہ اور مصلحت ہی یہ ہے میں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں زندگی کا بھروسہ نہیں، میرے بعد کوئی اتنا بھی نہیں کہ دو پیسہ کا دودھ بازار سے لادے، ایک وارث تو سر پر ہوگا،

سعیدہ ....

خالہ، ارے بھئی بچہ ہے ڈرتی ہے کہ خبر نہیں کس سے سابقہ پڑے،

باپ، تو ہم کیا آنکھوں کے اندھے ہیں کہ دھکا دیدیں گے،
خالہ، دودھ کا جلا چھاچ کو پھونک کر پیتا ہے،
باپ، ہاں تو اب اچھی طرح اطمینان کیوں نہ کریں گے،
خالہ، نہیں تم بے فکر ہو یہ کیا تمہارے حکم سے باہر ہے،
باپ، میرا حکم کیا ابھی کیوا سطے پڑ روکر، ساری رات اسی ادھیڑبن میں گذر جاتی ہے
خالہ، تم اپنا دل کیوں بھاری کرتے ہو،
باپ، میں تو ذرا جارہا ہوں، بڑے بچہ کا ٹوپ لے آؤں،
خالہ، اچھا،
باپ اُٹھکر باہر گیا تو سعید نے کہا،
اچھی خالہ جان میری تو روح فنا ہوتی ہے مجھے تو معاف ہی کرو،
خالہ، بیوی تو بھی بچی ہے وہ بھی بچے ہیں،
سعید، اب تو آپ اس معاملہ پر خاک ہی ڈالیے،
خالہ، بچوں کی سی باتیں نہ کرو پانچوں انگلیاں ایکساں نہیں سب ہی مرد اسلام جیسے نہیں ہیں،
سعید، کیا کہوں کچھہ کہہ نہیں سکتی،
خالہ، بس کہنا سننا کچھہ نہیں مصلحت یہی ہے،
سعید، .... ٹھنڈا سانس،
خالہ، خدا پر بھروسہ کرو،
سعید، جی ہاں ....
خالہ، وہی بیڑا پار کرے گا،
سعید، میری تو عقل چکرا رہی ہے،

بڑے میاں کی شادی کسی غیر جگہ نہیں اپنی خالہ کلثوم سے قرار پائی تھی جو
ایک بچہ کی بھی ماں نہ تھیں، سعید کے کیا کنبہ کے کسی مرد یا عورت کے وہم و گمان
میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ سعید کے نکاح ثانی کی تہ میں یہ نکاح ہے۔ بڑے
میاں دن رات اسی چکر میں تھے کہ کسی راستہ چلتے کا ہاتھ پکڑ اس کے سر
بیٹی چپیک دولہا بنیں، مگر جس طرف نظر ڈالتے تھے ایوسی ہی مایوسی نظر
آتی تھی، یوں کنبہ میں کوارے لڑکے تین چار اور موجود تھے، اور گو سعید بچوں کی
ماں تھی، مگر ان سے عمر میں چھوٹی لیکن کس کو غرض پڑی تھی کہ دولت جہیز چھوڑ چھاڑ
ایسی غریب سے نکاح کرتے ایسے رنڈوے ان کے خیالات کواروں سے بھی
بڑھے ہوئے تھے الغرض بڑے میاں اور بی خالہ ہر وقت ادھیڑ بن میں تھے مگر
کامیابی نہ ہوتی تھی، مجبور بڑے میاں نے یہ طے کیا کہ لڑکی کی وجہ سے میں نے
کیوں دیر کی میں اپنا نکاح کر جھگڑا چکاؤں اس کا ہوتا رہیگا، مگر خالہ سمجھدار تھی، اور
جہاں دیدہ دور اندیش تھی اس رائے سے متفق نہ ہوئی اور تاڑ گئی کہ اگر سعید کا نکاح
نہ ہوا تو یہ بلا اور اس کی ذریات عمر بھر کو پیچھے چمٹی، مجھ کو جو مقصد نکاح سے پورا کرنا ہے
وہ ہوگا نہیں، اور جب میرا نکاح پہلے ہو گیا تو پھر باپ کو ضرورت ہوگی، نہ سعید
رضا مند اس لئے اس نے بڑے میاں سے صاف انکار کر دیا، اس انکار نے بڑے
میاں کو بہت سست کیا مگر سوچتے سوچتے ان کے دل میں رات کو سوتے وقت
کوئی گیارہ بجے کے قریب یہ بات پیدا ہوئی کہ احمد علی کارخانہ دار کی بیوی چھ بچے
چھوڑ مری ہے وہ نکاح کرنے کو کہتے تھے، بڈھے آدمی ہیں آسانی سے کام بن جائیگا
یہ خیال آتے ہی نیند تو چکر ہوئی، اور بے چینی ایسی بڑھی کہ اسیوقت اچکن پہن سیدھے
اٹھ کارخانہ دار کو جا آواز دی۔

آدہی رات کا وقت جاڑے کا موسم، مہاوٹوں کے دن بجلی بہی کڑک رہی تہی احمد علی غریب ڈرگیا کہ یہ کیا مصیبت آئی کنڈی کہولی تو حضرت، گھبراکر پوچہا جناب خیر تو ہے،

بڑے میاں جی ہاں اللہ کا شکر ہے،

کارخاندار پہر اس وقت کیسے تکلیف فرمائی،

بڑے میاں تمہارے ہی کام کو آیا ہوں،

کارخاندار اس وقت

بڑے میاں جی ہاں،

کارخاندار فرمائیے،

بڑے میاں تم نے مجہہ سے نکاح کے متعلق کہا تہا نہ اس کی سبیل ہوگئی ہے،

کارخاندار عذر تو مجہے کچہہ نہیں ہو مگر لڑکی کواری ہو تو بہت اچہا ہے،

بڑے میاں جی نہیں کواری تو نہیں ہے،

کارخاندار یہ وقت ہے جناب،

بڑے میاں مگر تم سوچو تو سہی یہ تمہاری ہماری عمر کواری سے نکاح کرنیکی ہے،

کارخاندار جناب اپنی اپنی سمجہہ ہے،

بڑے میاں بہائی تو کواری تو مشکل سے ملیگی،

کارخاندار اجی حضرت خدا کا نام لیجئے کئی پیغام موجود ہیں،

بڑے میاں پہر دیر کاہے کی ہے،

کارخاندار ذرا غریب ہیں اور میں چاہتا ہوں کہاتے پیتے ہوں،

بڑے میاں بہائی تو معاف کرنا ایسے آپ میں کیا لال لگے ہوئے ہیں کہ کواری بہی ہو مالدار بہی ہو

کارخاندار تم دیکہہ لینا دلہن انشاءاللہ جیسے آؤ ہی گے،

بڑے میاں، خیر بھئی اللہ کی مرضی،

کارخانہ دار، آپ اتا پتا تو بتلائیے کس کی لڑکی ہے،

بڑے میاں، بس جانے دیجئے

کارخاندار، ارے میاں آدھی رات کو تکلیف کی ہے تو پتہ بتاؤ

بڑے میاں، جب تم کو کرنا ہی نہیں تو پوچھنا کیسا،

کارخاندار، کون خاندان ہے

بڑے میاں، شریفوں کا خاندان ہے،

کارخاندار، کون لوگ ہیں،

بڑے میاں، بھلے مانس ہیں،

کارخاندار، عمر کتنی ہوگی لڑکی کی،

بڑے میاں، کوئی چوبیس برس کی،

کارخاندار، بچہ وچہ تو نہیں ہے،

بڑے میاں، ہیں تو سہی،

کارخاندار، نہیں جناب میرے بس کا روگ نہیں کے بچے ہیں

بڑے میاں، تین ہیں شاید

کارخاندار، واہ جناب چھ تو یہ تین وہ تو ہوگئے میری تو تبڑی بیٹ جائیگی،

بڑے میاں، رازق تو اللہ ہے،

کارخاندار، یہ صحیح ہے مگر ہمت نہیں پڑتی،

بڑے میاں، جانے دو،

کارخاندار، صورت شکل کیسی ہے،

بڑے میاں، بس آدمی کا بچہ ہے

کارخاندار، حضرت عمر نہیں شکل نہیں، روپیہ نہیں، پھر کیا ہے،
بڑے میاں بھائی تو زبردستی تھوڑی ہی، تم نے ایک بات کہی تھی کان میں پڑی ہوئی تھی، اس وقت ایک موقع ملا میں نے کہا چلو کہہ دوں،
کارخاندار، موقع تو ایک چھوڑ دو دو ہیں شکل صورت بھی، روپیہ پیسہ بھی اور دونوں کواریاں مگر اتنی بات ہے کہ ایک کی آنکھ میں پھلی ہے اور دوسری سیتلا منہ داغ،
بڑے میاں، اچھا بھئی تو چلتے ہیں،
کارخاندار، پان تو کھا لیجئے، میں لاتا ہوں،
بڑے میاں، نہیں بس رہنے دو،
کارخاندار، اچھا یہ تو بتاؤ لڑکی پڑھی لکھی تو نہیں ہے،
بڑے میاں، پڑھی لکھی تو ہے،
کارخاندار، بس تو نوذ علی بوذ ہے،
بڑے میاں، سلام علیکم،
کارخاندار، ٹھہرو پان کھاتے جاؤ،
بڑے میاں، نہیں بس جانے دو،
کارخاندار، واہ ابھی لایا،
بڑے میاں، نہیں نہیں بس جانے دو،
کارخاندار، خاندان تو بتاؤ کونسا ہے،
بڑے میاں، کہہ تو رہا ہوں شریفوں کا ہے،
کارخاندار، بھائی تم سمجھو تو سہی اول تو یہ مشینیں ابھی نکلی ہیں کہ سب کام چوپٹ ہو گئے بارہ مہینہ کا مندا دوسرے کاریگروں کے دماغ آسمان پر پہونچ گئے، روپیہ سوا روپیہ روز کا خرچ نواب ہے اور آمدنی کا یہ حال ہے کہ مشکل سے دھیلی بارہ آنے کے پیسے بچتے ہوں گے

اس کا خرچ اور بڑھے گا۔ اگر مرنے بھرنے والی ہوئی تو خیر تنگی ترشی گذر جائیگی اور
جو کہیں ہوئی چلتی ہوئی تو اور مصیبت ہوگی۔

بڑے میاں تو میں تمہارا دشمن تو نہیں ہوں۔

کارخاندار۔ آپ نے اطمینان کر لیا۔

بڑے میاں۔ جب آدھی رات کو آیا ہوں۔

کارخاندار۔ خیر تو میں حاضر ہوں بسم اللہ کرو۔

بڑے میاں۔ اچھا۔ سلام علیکم۔

(۱۱)

شام ہو چکی تھی اور سعید اپنے تینوں بچوں کو لئے خاموش ایک کمرہ میں بیٹھی کسی
خیال میں غرق تھی، سوچتے سوچتے نہ معلوم وہ کس نتیجہ پر پہونچی کہ اس کی آنکھ سے
ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اور اس نے باآواز بلند کہا۔

یقیناً میرے ساتھ ظلم ہو رہا ہے اور وہ ظلم جو تعجب نہیں میری عمر برباد کر دے
خبر نہیں کیسا شخص ہو کس مزاج کا آدمی ہو۔ لاکھ نیک ہو مگر پرائے بچوں کو محبت سے
دیکھنا مشکل ہے۔ کیا کرونگی۔ کیا ہوگا۔ یا اللہ کیسی مصیبت میں پھنسی۔ میرے تو گمان
میں بھی نکاح نہ تھا یہ کیا ہو رہا ہے

سعید ان ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھی کہ بڑے لڑکے نے کھانا مانگا اٹھی
اسکو لاکر کھا دیا اور پھر گم سم بیٹھ گئی۔

بیوہ کے نکاح سے اختلاف ہم کو کیا کسی مسلمان کو نہیں ہو سکتا۔ بالخصوص
اس حالت میں کہ عمر زیادہ نہ ہو مگر اس باپ نے جس وجہ سے نکاح ضروری سمجھا وہ
ایسی کمزور بےبنیاد تھی کہ یہ محبت نہیں عداوت تھا۔ اور کرم نہیں ستم تھا۔ لڑکی کا پہلا
نکاح جس نام نہاد نسبت رکھتا تھا وہ بھی اس سے کچھ کم نہ تھا جس طرح اس میں تمام

عمر کا انحصار اسی تعلق پر تھا اسی طرح اب بقیہ عمر کا ضرورت تھی کہ جس غور و خوض سے
جس فکر و کوشش سے جس تگ و دو سے پہلا نکاح کیا تھا ایسی تو یہ اور غور سے دوسرا
بھی ہوتا مگر یہاں تو ظالم باپ اپنے نکاح کیواسطے چھرا اتار رہا تھا اسکو سب سے
پہلے یہ سمجھنا اور غور کرنا تھا کہ اسکے ساتھ جو تین بچے ہیں۔ اُن کی پرورش کا کیا
سامان ہوگا۔ زمانہ اتنا نازک اور وقت ایسا ٹیڑھا ہے کہ انسانیت اور ہمدردی
مسلمانوں میں بالکل ہی گم ہوگئی اور ایسا شخص جو پرائے بچوں کو اپنے برابر سمجھے آدمی
نہیں فرشتہ ہے اگر نکاح کرتا تو پہلے بچوں کی پرورش کا سامان کرتا یہ صحیح کہ مرنے والا
باپ اتنا دور اندیش نہ تھا کہ معصوم بچوں کے واسطے کچھ اثاثہ چھوڑتا۔ لیکن
اب جو حالات تھے نظر انداز ہونے کے قابل نہ تھے دادی، نانی، خالہ، پھوپھی کوئی
نہ تھی جو بچوں کی پرورش کرتا مگر سب سے پہلی شرط سب سے پہلا اقرار سب سے ضروری
معاہدہ یہ ہونا لازم تھا کہ بیوہ تین بچوں کی ماں ہے۔ اور اس نکاح کا منشا ان بچوں
کی پرورش ہے،

نکاح بیوگان اسلام کا فیصلہ ناطق ہے ہم نے خود اس سلسلہ میں ایک کتاب
لکھی لیکن نہ تو اسلام کا مقصد یہ ہے نہ ہمارا کہ سعید کی طرح بیوہ کا نکاح کر کے
بیوہ عورت اور معصوم بچوں کی مٹی پلید کیجائے۔

آج سے پچاس برس پہلے مسلمانوں میں بیوہ کا نکاح اکثر خاندانوں میں عیب
سمجھا جاتا تھا لیکن وہ لوگ پردہ کے بھی سختی سے پابند تھے اور بیوہ کو ایسا
موقعہ کم ملتا تھا کہ اس کے جذبات ابھریں اور امنگیں پیدا ہوں حاشا وکلا اسکا
منشا یہ نہیں کہ ان کا یہ تمدن قابل پسندیدگی تھا۔ بحث صرف اس سے ہے کہ گو یہ
ایک قسم کا ظلم ضرور تھا مگر عصمت پر حرف نہ آنے پاتا تھا۔ اور بیوہ مہینوں کی نہیں
دنوں کی بلکہ ایک ایک دو دو دن کی بیاہیاں رنڈاپے ہو کر قبر تک اسی طرح بیٹھ جاتی

تھیں مگر ان کا دامن ہر دھبے سے پاک رہتا تھا اب کہ مسلمانوں کا تمدن ان کے طریقہ ان کی عادتیں ہر چیز ترقی کر رہی ہے پردہ کی مخالفت زور شور سے ہوئی ہے بیوہ عورت کیواسطے آزادی کے مواقع میسر آنا سم قاتل ہے اور ضرورت ہے کہ احکام الٰہی کی تعمیل پوری کی جائے۔ مگر ضرورت ہے کہ سب سے پہلے بیوہ کی عمر پر نظر ڈالی جائے۔

اگر عمر نکاح ثانی کی متقاضی ہو تو جس طرح نکاح اول میں اسکا مشورہ مقدم تھا اسی طرح نکاح ثانی میں اس کے خیالات کا اندازہ۔ پہلے موقع پر رائے کے معلوم کرنے میں دقت ہو مگر دوسرے موقع پر مطلق دقت نہیں اس طرف سے اطمینان ہونے کے بعد۔ یہ دیکھنا ہے کہ بیوہ کے بچوں کی ماہے۔ اور اگر اس معاہدہ پر کوئی شخص رضامند ہو کہ وہ نکاح کے بعد نہ صرف بیوہ کی ضروریات کا کفیل ہوگا بلکہ بالغ ہونے تک یتیم بچوں کی بھی پرداخت و پرورش کریگا۔ تو اس سے نکاح کرنا چاہیئے لیکن مرنے والا باپ اگر کچھہ اثاثہ چھوڑ گیا ہے تو ضرور ہے کہ باپ یا ماں کے عزیز بچوں کی پرورش اپنے ذمہ لیں اور کار ثواب سمجھہ کر اپنے بچوں کی طرح پالیں۔

سعید کا دوسرا نکاح نکاح ہی نہ تھا۔ باپ کے نکاح کا تتمہ تھا اور یہ نکاح جس کے نام سے سعید کانپ رہی تھی نکاح نہیں نکاح بالجبر تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ بدنصیب کے عزیز واقارب میں بھی کوئی اتنا نہ تھا کہ ظالم باپ سے جدا ہو کر پناہ لیتی۔

یہ درست ہے کہ بڑے میاں اپنی طرف سے بیوی کے ساتھ بیٹی کو بھی قبر میں سلا چکے تھے اور اب سعید کا ہر لمحہ ان کے عیش پیری میں حائل تھا۔ مگر انسانیت بھی ایک تھی۔ بھولی بھالی لڑکی پر یہ بلائے بے درماں وہ ستم تھا جسکی تلافی کسی طرح ممکن نہ تھی اور اس ظلم کی تہ میں اپنے بڑھاپے کے چند روز صرف بڑے میاں کی رائے میں اچھے گذر جانیکے سوا اور کچھہ نہ تھا۔ لیکن ضرورت یہ تھی کہ بڑے صاحب

اگر مرنے والی بیوی کے ساتھ اس کی اولاد کے حقوق بھی دفن کر چکے تھے تو اتنا تو سوچ لیتے کہ میرے اپنے نکاح کے بعد جو اولاد ہوگی اور جسکو میں بغیر کسی اثاثہ کے پانچ پانچ چار چار برس کا چھوڑ کر مرونگا۔ اس کی پرورش کون کرے گا۔

۱۲

صبح کے دس بجے ہوں گے سعیدہ چپ چاپ ایک ٹوٹی سی چارپائی پر دل ہی دل اپنی مصیبت پر رو رہی تھی کہ خالہ جو تین چار دن سے اس مرحلہ کو طے کرنے کے واسطے مقیم تھیں ہنستی ہوئی آئیں اور کہا۔

بیٹی چپکی چپکی کیوں بیٹھی ہے۔

سعیدہ۔ جی کچھ نہیں

خالہ۔ آخر

سعیدہ۔ یہی دنیا کے جھگڑے اور کیا۔

خالہ۔ خدا کا شکر ہے رنج کے دن کٹ گئے۔ اب عمر بھر راج کرنا۔

خالہ نے خیال کیا تھا یا متوقع تھیں کہ یہ فقرہ سعیدہ کو نہال نہال کر دیگا۔ مگر یہ الفاظ بجلی کی طرح اس کے دل پر گرے وہ چونک کر کہنے لگی۔

آپ مجھے کیوں چھیڑتی ہیں میں تو آپ کی بچہ ہوں۔

خالہ۔ اے ہے سعیدہ سچ مچ کیوں چڑ گئی۔ سچی بات کہہ رہی ہوں۔ لڑکا بھی اللہ کا شکر ہے ایسا ہیرا ملا ہے کہ ہمیشہ ہنسی خوشی رہو گی۔

سعیدہ۔ یہ آپ کیا فرما رہی ہیں۔

خالہ۔ اب فرمانا ورمانا کیا [illegible] آج بھی اچھا سا [illegible] عنقریب انشاء اللہ [illegible]

سعیدہ۔ [illegible] خبر کی خوشی مگر ایسی جلدی کی کیا ضرورت

میں اپنے کھانے پینے کا انتظام الگ کروں گی میرا خرچ ان پر نہ پڑے گا۔
خالہ نہیں حرج کی کیا بات ہے مگر موقعہ ہی یہ ہے۔ لڑکا کل حیدرآباد چلا جائیگا۔

مجبور سعید کے پاس اسکا جواب کیا ہو سکتا تھا وہ دیکھ رہی تھی کہ باپ بھی سامنے کھڑا ہے۔ مگر اسوقت اس کی حالت ایسی ابتر ہوئی کہ کھڑی ہوئی خالہ کے آگے ہاتھ جوڑے اور کہا۔

خدا کے واسطے رحم کرو"

خالہ اسکے جواب میں ہنسی اور کہنے لگی تو بچہ ہے۔ ڈرتی ہے۔ گھبرا نہیں اللہ چاہے تو عیش کرے گی۔

اب سعید خاموش تھی۔ اسکی حالت کیا تھی۔ اسکے دل پر کیا گذر رہی تھی اسکا اندازہ خود ہو سکتا ہے۔ عصر کیوقت کارخاندار سے نکاح ہوا اور سعید اپنے بچوں سمیت باپ کے گھر سے نکل کارخاندار کے ہاں پہنچیں۔

ادہر سعید رخصت ہوئی ادہر بڑے میاں دولہا بنے اور اسی قاضی نے جس نے سعید کا نکاح پڑھایا تھا۔ ان کا نکاح بھی پڑھا دیا۔

(۱۳)

کارخاندار کہنے کو تو کام پیشہ ہے۔ مگر بڑا کا بچہ نہیں تجربہ کار آدمی ہے۔ سعید خوش رہے گی۔

بیوی۔ بڑی مشکل سے قبضہ میں آئی ہے۔ کیسے کیسے اتار چڑھاؤ دے ہیں کہ صرف راضی نہ ہوتی تھی۔

بڑے میاں۔ پہلے شوہر سے ڈری ہوئی ہے۔

بیوی۔ آج میاں رہ نہ ہے جاؤ یا تم جاؤ۔

بڑے میاں۔ ابھی نہیں ذرا اس کا دل وہاں لگ جائے۔

بیوی۔ خیر تو بنی چاہیے وہاں کیا گذری۔ ہاں دیکھنا مجھے تو بہت بڈہا معلوم ہوتا تھا

بڑے میاں۔ بڈہا نہیں تو کیا جوان ہے۔ جوان کو کیا غرض پڑی ہے کہ رانڈ سے شادی کرے۔ لڑکوں کا ایسا توڑا ہے کہ اس بڑھاپے میں بھی اس کے پاس تین تین پیغام تھے۔ اور ایک سے ایک افضل۔ ماباپ کو کبھی بیٹی کا حال پوچھنا ہی نہ چاہیے۔ اب تو اسی گھر میں مرنا اور بھرنا جو لوگ اس تکا دویں سہتے ہیں کہ بیٹی کو تکلیف تو نہیں وہ غلطی پر ہیں۔ لڑکی کو یقین ہو جانا چاہیے کہ میرا کوئی حمایتی ہے ہی نہیں۔ یہ ہی میں نے اس کے پہلے موقعہ پر بھی کیا۔ کچھ یہ نہیں کہ آج اس کی ما موجود نہیں تو میں فرنٹ ہو گیا ہوں نہیں میری ہمیشہ کی یہ ہی رائے ہے۔ رشیدہ آج چھ برس سے مدراس میں ہے اس کی خیر خبر تک نہیں خط آئیگا جواب لکھدونگا، جہاں رہو خوش رہو۔

بیوی۔ اچھا تو سویرے سویرے وہ چکن تو لادو میں اپنا کرتہ سی لوں۔

بڑے میاں۔ ہاں ابھی جاتا ہوں۔

بیوی۔ میں تو جانوں دوپٹہ کی بھی چکن ہی لے آؤ۔

بڑے میاں۔ اچھا ہاں دوپٹہ بھی اس کا رہے گا تو اچھا۔

بیوی۔ مگر اب ہی لادو پرسوں کی تو شادی ہی ہے۔

بڑے میاں۔ ہاں ابھی لاتا ہوں۔

بیوی۔ ہو سکے تو ایک چادر گز پہوا بھی لے لینا

بڑے میاں۔ ضرورت ہو تو لے آؤں ورنہ کچھ رہنے دو لینا

بیوی۔ ہاں سیتے ہی آنا۔

بڑے میاں۔ ہاں اور جوتی کی نپان تو دو۔

بیوی ۔ مجھے تو پاؤں ناپنا آتا نہیں ۔ تم خود ہی ناپ لو ۔

بڑے میاں ۔ مجھے خود نہیں آتا ۔

بیوی ۔ پھر کیا کروگے ۔

بڑے میاں ۔ لاؤ پرانی جوتی دے دو ۔

بیوی ۔ اچھا لے جاؤ ۔

بڑے میاں نئی بیوی کی پرانی جوتی کپڑے میں لپیٹے بغل میں لیے بلاغ باغ چلے جا رہے ہیں ۔ نئی جوتی کی جھلک ۔ چکن کی بہار ابھی سے ان کی آنکھ کے سامنے تھی کہ رستہ میں کارخاندار ملا اور کہنے لگا ۔

واہ حضرت اچھا سلوک کیا آدمی تو اپنی ذات سے اچھا ہے لیے زبان بھی ہے اور غریب سیدھی مگر یہ تین تین بچھو کیسے جان کا وبال ہیں ۔ نہ روٹی ٹکڑے کی حلاوت ۔ نہ بات چیت کا مزا ہر وقت اسی ٹیٹک منجے میں لپٹی رہتی ہے بھلا میں غریب آدمی دہلی بارہ آنہ کا مزدور تین سیر آٹے میں چٹکی نہیں بچتی ہیں ۔ نے نکاح اپنے آرام کو کیا تھا یا ان الفتوں کی پرورش کو اور یہ دیکھیے بچے کہلاتے تو شریف زادے ہیں مگر ایسے کھاؤ اور پیٹل کہ الٰہی توبہ ۔ وہ چھوٹا دیکھئے نہ توڑ دیتا ہے ۔ بھلا یہ عمر اور پانچ روٹیاں ۔ آج صبح کو باسی کھچڑی کا طباق لبالب بھرا ہوا میرے سامنے چٹ کر گیا ۔ بھورا نہ چھوڑا بھورا ۔

بڑے میاں ۔ آپ سے کہہ تو دیا تھا کہ بچے ساتھ ہیں

کارخاندار ۔ مجھے یہ خبر تو نہ تھی کہ بچے جن ہیں ۔

بڑے میاں ۔ اجی جناب بچوں کا سب جگہ یہی حال ہے ۔

کارخاندار ۔ جی نہیں میرے اپنے بچے بھی ہیں اپنے سامنے بٹھا کر کھلا لیجیے آپ کے بچوں سے آدھا کیا پاؤ پیٹ بھی نہیں ہے ۔ اور پیچھے سر منڈاتے ہی اولے پڑے

کپڑا ہے نہ جوتی تینوں کے تینوں ننگے پاؤں پھرتے ہیں۔
بڑے میاں۔ بھائی تقدیر انکی تمہاری حب ہو پہناؤ نہ ہو نہ پہناؤ
کارخاندار۔ جناب ان بچوں کو تو آپ سنبھالیے۔
بڑے میاں۔ آپ نے بھی کیا بات کہی ہے۔
کارخاندار۔ کیوں غلط کیا کہہ رہا ہوں۔
بڑے میاں۔ جب بچوں کو میں نے سنبھالا تو لڑکی ہی مجھے کیا دو بھر تھی۔
کارخاندار۔ تو جناب ان جنگی بچوں کا خرچ مجھ سے نہیں اٹھتا۔
بڑے میاں۔ آپ نے پہلے کہدیا ہوتا۔
کارخاندار۔ پہلے نہیں کہا تو اب کہہ رہا ہوں۔ آپ خود ہی سوچیے میری حیثیت اتنی ہے کہ سب کا خرچ اٹھاؤں، اپنے نہ معلوم کس طرح گذارہ کر رہا ہوں۔ یوں کہیے اللہ آخر وقت تک بھرم نباہے رہے۔
بڑے میاں۔ اب اس وقت تو میں جا رہا ہوں
کارخاندار۔ بسم اللہ۔

(۱۴)

میں نے تجھ سے بیس دفعہ کہا کہ مجید کی روٹی میں گھی لگا دیا کر مگر تو ایسی بے غیرت عورت ہے کہ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی میں جو کما رہا ہوں یہ اپنے بچوں کے لیے یا تیرے ان ڈھینگروں کے واسطے۔
سعید۔ گھی تھا نہیں۔ ورنہ میں ضرور لگا دیتی
کارخاندار۔ نہیں تھا۔ اری ڈیوڑھی ہوئی ہے پرسوں ہی تو آٹھ آنے کا گھی آیا ہے۔
سعید۔ ختم ہو گیا
کارخاندار۔ پھر وہی آنکھوں میں خاک جھونکتی ہے۔

سعید۔ " " " " " " " " " " " "

کارخاندار۔ ختم کیسے ہوگیا دال میں پڑا نہیں سالن پکا نہیں پھر کیونکر ختم ہوگیا قطعی تو نے اپنے بچوں کو ٹھسایا۔ میں ہزار دفعہ کہہ چکا ہوں کہ اپنے بچونکو ہمارے بعد روٹی کھلایا کر۔ مگر تو خاک نہیں سنتی۔ میری تو اچھی جان مصیبت میں آئی ہے بڈھے نے اپنی بلا میرے سر چپیکی اور بے ایمان نے دوست بنکر مارا پرسوں گھنٹہ بھر مغز مارا ہے کہ ان بچوں کو بیجاؤ۔ مگر نہیں سنی۔

سعید۔ اس میں میرا کیا قصور ہے اور یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے اپنے بچونکو کھلا دیا جب سے آپ نے فرمایا ہی ہمیشہ آپکے اور آپکے بچوں کے بعد انکو بچی کھچی دیدیتی ہوں اور اگر نہیں بچتی یا کم ہوتی ہی تو بھوکا سلا دیتی ہوں۔

کارخاندار۔ اری میسمسی کیوں باتیں بناتی ہے۔ جھنی تو ہے بھی تو بڑی ایماندار۔ اور ہم نے کہا تھا کہ اس اپنے بڑے ڈھٹو حاتم کو کام پر بھیجا کر۔ تو نے بھیجا۔

سعید۔ مجھے عذر نہیں مگر یہ تیسری جماعت میں پڑھ رہا ہی اسکی تعلیم برباد ہو جائیگی

کارخاندار۔ کیا بیوقوف عورت ہی۔ مزدوری نہ کرے گا تو کھائیگا کہاں سے میری کیا جوتی کو غرض پڑی ہے کہ اپنا پیٹ کاٹوں اور ان کا بھروں۔ پڑھ لکھہ کر کچھہ تو نہال ہوئی کچھہ یہ نہال ہوں گے۔

سعید۔ " " " " " " " " " " "

کارخاندار۔ کام سیکھہ لیں گے تو ایک ہنر تو ہاتھ میں پڑ جائے گا

سعید۔ " " " " " " " " " " "

کارخاندار۔ اب اس کا جواب کچھہ نہیں ہے۔

سعید۔ اچھا۔

کارخاندار۔ مگر اسکی عادتیں بگڑی ہوئی ہیں۔ یہ کیا کام سیکھے گا۔ چھٹا ہوا نہیں

دل شیر ہو کہ کھلی ہوئی کام کرے اس کی جوتی۔

سعید۔ جیسی پڑے گی بھگتے گا۔

کارخاندار۔ ورے آبے

توسید ہا خلیفہ جی کے ہاں چلا جا موم گروں میں ٹٹی کا کارخانہ تو جانتا ہوگا جا وہاں جا کر بیٹھ میں بھی روٹی کھا کرآتا ہو۔ اور دیکھ جو تو نے کام سے جی چرایا یا خلیفہ نے شکایت کی تو یاد رکھیو کھال سونت دونگا۔

ما خاموش بیٹھی منہ تکتی رہی حاتم نے ماں کے چہرہ پر ایک نظر ڈالی کہ شاید اسکی زبان اس ناگہانی مصیبت کے رفع کرنے میں کچھ کام آئے۔ مگر اسکو معلوم نہ تھا کہ سنگدل باپ نے بیٹی کی زبان ہمیشہ کو کیل دی ۔ دونوں ماں بیٹے خاموش کھڑے تھے۔ مگر نظریں ایک دوسرے کے چہرہ پر تھیں کہ کارخاندار بولا۔ ابے پہلے تو یہ اپنا بستہ تو رکھ۔ ان کتابوں کو آگ لگا۔ اور تختی سلیٹ کو چولہے میں رکھ۔

اس کا جواب بھی تعمیل کے سوا کچھ نہ ہو سکتا تھا لڑکا خاموش تھا کہ سوتیلا باپ بگڑ کر اٹھا اور کہنے لگا:۔

ابے سنتا نہیں ہم کیا کہہ رہے ہیں۔

سعید۔ میں رکھدیتی ہوں

کارخاندار۔ تو کیوں رکھتی ہے وہ آپ کیوں نہیں رکھتا۔

سعید۔ وہی رکھدے گا۔

کارخاندار۔ ہاں تو اسی سے رکھوا۔

سعید۔ اچھا۔

حاتم نے کتابیں سمیٹیں تختی اٹھائی سلیٹ گھسیٹی اور سب چیزیں ایک جا جمع کر طاق میں رکھدیں۔

کارخاندار۔ اب اگر مدرسہ کا نام لیا تو مارے جوتوں کے فرش کر دونگا

سعید۔ نہیں اب نہ کہے گا۔

کارخاندار۔ پتہ سمجھ گیا۔

حاتم۔ " " " " " " " " " " "

کارخاندار۔ کیا مگر المڈا ہے۔

حاتم۔ " " " " " " " " " " "

کارخاندار۔ مارے جوتوں کے فرش کر دونگا

سعید۔ جاتا ہے۔ ابھی جاتا ہے۔

کارخاندار۔ تو اپنا لقمہ دے جائیو۔

سعید۔ ابھی چلا جاتا ہے۔

حاتم نے اب پھر باکی صورت دیکھی اور بجائے مدرسہ کے آج بلبی کے کام پر روانہ ہو گیا۔

(۱۵)

مرزا حمید بیٹی کے نکاح سے فارغ ہو پوری طرح کھل کھیلے۔ سنا یہ تھا کہ جا کر جو نہ آئے وہ جوانی دیکھی" مگر دیکھا یہ کہ بڈھے دولہا اور بڑھیا دولہن بڑھاپے میں از سر نو جوان ہو گئے اور ایسے کہ سچے جوانوں کو مات کیا یہ توقع ہی غلط تھی کہ حمید کو کبھی بھولے سے بھی بیٹی یا اسکے بدنصیب بچوں کا خیال آتا افسوس سکا ہے کہ دنیا دکھا دے کو بھی حمید یا اس کی بڑھیا دولہن نے کبھی جھوٹ موٹ کا کوئی حصہ بھی نہ بھیجا۔ کچھ یہ نہ تھا کہ خدانخواستہ مفلسی ہو۔ جوانی کے عود کرتے ہی ذرائع آمدنی بھی بڑھ گئے تھے اور روزمرہ نت نئے سوانگ ہونے سے بنتے تھے اچھے سے اچھا کپڑا اور بہتر سے بہتر کھانا آتا اور تیار ہوتا مگر لطف یہ کہ پرانا دہرا!

اور بچا کھچا محلہ والوں کو ملتا پھک کر جاتا۔ خوشامدیوں کی نذر ہوتا اور الفتول کے پیٹ میں پڑتا مگر کٹے اس باپ کا منہ اگر بھولے سے بھی کہا ہو کہ آج سعید کے یتیم بچوں کو بھیجدو اور جلے اس سوتیلی ماں کی زبان اگر اس سے یہ نکلا ہو کہ لاؤ یہ تو بدنصیب بچی کو بھیجدوں۔

سوتیلی مائیں تمام دنیا میں بدنام ہیں اور ان کے مظالم کی داستان سے کتابوں کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ انکی حمایت لینا یا انکو بھلا کہنا لاریب خلاف انصاف مگر یہ کیسا لطف ہو کہ باپ کا دامن ہر جگہ اور ہر معاملہ میں پاک۔ حالانکہ ماسے بدرجہا زیادہ باپ ان مظالم کا ذمہ دار ہے افسوس تاریخ خلاف توقع واقعات پر ہوتا ہے۔ سوتیلی ماکی نفرت پر اسوقت تعجب ہوتا جب کسی بیوقوف نے اس سے مشفقت کی توقع قائم کی ہوتی۔ اسکے سپرد کام ہی وہ کیا جارہا ہے جس میں غیر ما کے بچوں سے اسکی منافرت یقینی ہے۔ آخر شوہر صاحب کو یہ حق کہاں سے ملگیا کہ وہ بیوی سے یہ توقع رکھیں کہ انکے بچوں کو اپنے بچوں کے برابر سمجھے وہ جو کچھ کر رہی ہے فطرت کے موافق یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک مرد ہو یا عورت کسی وجہ یا سبب سے فطرت بدلدے یہ تغیر اس کے اختیار سے باہر اور قبضہ سے دور ہے جہاں جہاں سوتیلی ما کے مظالم سنے گئے وہاں ہمیشہ عورتیں مورد الزام رہیں لیکن ان آنکھوں کے اندھوں کا رونا نہ رویا گیا جنہوں نے اپنے نفس پر کلیجہ کی آگ قربان کردی اور جس اولاد کے پہلی بیوی کی زندگی میں عاشق زار تھے چند ہی مہینوں کے الٹ پھیر میں ایسے بیزار ہوئے کہ دوسری بیوی کی شکایت پر اس کی شکل دیکھنی ناگوار ہونے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مرزا حمید کی بڑھیا دلہن کو باوجود صریح غفلت کے ہرگز ہرگز قابل الزام نہیں سمجھتے [illegible] سے اگر شکایت ہو سکتی ہے اس پر اگر الزام آسکتا ہے تو صرف [illegible]

نہ لیا۔ ہم یہاں تک بھی کہنے کو تیار نہیں کہ اس نے انسانیت کو طاق میں رکھ دیا اسکا اور سعید کا معاملہ حاکم و محکوم کا تھا اور اگر وہ سمجھتی تو سعید ایک مظلوم عورت اور اسکا شوہر ایک ظالم باپ تھا لیکن اس نے اگر نہ سمجھا تو فطرت کے عین موافق تھا اور حمید کے مقابلہ میں اس کا گناہ پاسنگ بھی نہیں۔ حمید کا پہلا قصور پہلا جرم پہلی خطا اور پہلی بیہودگی یہ تھی کہ اس نے بے وارثی اور بیوہ بچی کو دوہاکا دیا اور ایک ظالم شوہر کے قبضہ میں پھنسوا دیا۔ اسکو دیکھنا چاہیے تھا کہ جس شخص سے میں نکاح کر رہا ہوں اس بوجھ کا اہل بھی ہے یا نہیں اس پر طرہ یہ کہ گرمی کے دنوں میں دس دس اور بارہ بارہ سیر برف روز صرف ہو۔ دونوں میاں بیوی کے واسطے آئے۔ رات کے گیارہ بجے کے بعد گھل گھل کر جائے مگر سنگدل کو کبھی اتنا خیال نہ آئے کہ بدنصیب لڑکی کو ٹھنڈا پانی بھی مشکل سے نصیب ہوتا ہے سننے والے کہیں گے کہ ایسا سنگدل باپ مشکل سے ہوگا۔ مگر دیکھنے والوں نے مرزا حمید سے زیادہ لاپروا باپ دیکھے ہیں۔ اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس کی ذمہ داری سوتیلی ماں پر مطلق عاید نہیں ہوتی۔

گرمی کے دنوں میں جب لو کے جھکڑ چل رہے تھے اور دونوں میاں بیوی خس کی ٹٹی میں آرام فرما رہے ہیں یہی بدنصیب حاتم بھولا بھٹکا پھرتا پھراتا نانا سمجھ کر گھر میں گھس آیا اور آواز دی نانا کدھر ہیں۔ بچہ اس وقت تصویر عبرت تھا اسکے پاؤں میں جوتی نہ تھی اس کے جسم پر ثابت کپڑا نہ تھا پھٹا ہوا ایک تہمت بندھا تا دھرا تا میلا کچیلا ٹانگوں میں اور اس سے بدتر کرتہ گلے میں۔ سر ٹوپی سے محروم تھا اور لوہے کے پر ایک سرخ نشان بتا رہا تھا کہ کسی سنگدل نے سخت چوٹ لگائی ہے۔ اسکی آواز مرزا کے کان میں پہنچی بیوی کو باہر بھیجا اور جب اس نے جا کر کہا کہ حاتم ہے تو کہہ دیا یہ آنے کا کونسا وقت ہے۔ پوچھو تو کیا کہہ رہا ہے۔

نانی۔ بیٹا وہ پوچھتے ہیں کیسے آئے۔

لڑکا۔ جی یوں ہی چلا آیا۔

نانی۔ آخر کچھ تو کام ہوگا۔

لڑکا۔ جی کچھ بھی نہیں۔

نانی۔ پھر کیوں آیا ہے۔

لڑکا۔ یوں ہی۔

اب مرزا باہر نکلے اور کہا۔

"یہ کونسا وقت آنے کا ہے مدرسہ کیوں نہیں گیا۔

لڑکا۔ مدرسہ سے تو میں اُٹھ آیا کام پر جاتا ہوں۔

نانا۔ اچھا کام ہی سہی وہاں سے کیوں آیا۔

لڑکا۔ آنے کو جی چاہتا تھا

نانا۔ تو بھاگا ہوا ہے۔

لڑکا۔ نہیں میں بھوکا ہوں۔ ابھی چلا جاؤں گا۔

نانا۔ یہ کھانے کا کونسا وقت ہے۔

لڑکا۔ چلا جاتا ہوں۔

نانا۔ بیٹا کھانا تو ہم سب کھا چکے۔

لڑکا۔ بہت اچھا۔

اب نانی یعنی بڑھیا بہت باہر آئی اور کہا شاید روٹیاں رکھی ہوں تو میں دیدیتی ہوں۔

نانا۔ خیر دیدو یہ روز کی کُر لگ جائیگی۔

آنکھ اس قسم کے واقعات شب و روز دیکھتی ہے کیسا درد انگیز سماں ہو وہ بچہ جسکی صورت کا باپ عاشق زار تھا اور جس کے کرتہ پر معمولی میلا دھبہ ناگوار ہوتا تھا آج اسطرح

بھوکا پیاسا بیٹھا تھا کہ سر کے بال چھپر تھے بدن پر منوں میل تھا آنکھوں میں بیروں چیپڑ تھے پیٹ کو ٹکڑا تھا نہ تن کو چیتھڑا اور ظالم استاد نے لوہے کا گز اس زور سے منہ پر مارا تھا کہ خون جھلک رہا تھا۔ درد ہو رہا تھا مگر اس لیئے کہ رات سے بھوکا تھا ان دو روٹیوں کو جسپر کٹر نانی نے دال رکھدی تھی اور جانور نما ناد یکھ رہا تھا ایسا گرا کہ شاید چیل بھی گوشت پر نہ گرے گی جیسا اس حالت میں گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ گیا مگر شاید فطرت نسوانی یہ ہی ہوگی کہ بیوی اسکی صورت دیکھتی رہی اور پوچھا۔

حاتم تو کام پر کیوں بیٹھ گیا۔ اماکس طرح رہتی ہیں کارخاندار رکھتا تو اچھی طرح ہے،

لڑکا۔ کیا بتاؤں اللہ کا شکر ہے۔

نانی۔ آخر کچھ بتا تو سہی۔

لڑکا۔ وہ تو ہماری جان کے دشمن ہیں۔

نانی۔ اے ہے۔

لڑکا۔ دو دفعہ اتا جان کو مار چکے ہیں۔

نانی۔ واہ واہ۔

لڑکا۔ مجھے مدرسہ سے اٹھا کر کام پر بٹھا دیا۔

نانی۔ پھر اماں نے کچھ نہیں کہا۔

لڑکا۔ وہ کیا کہہ سکتی ہیں۔

نانی۔ یہ تیرے منہ پر نشان کیسا ہے۔

لڑکا۔ خلیفہ جی نے گز پھر اکر مارا رات کو کارخاندار صاحب نے اماں کی بہت بے عزتیاں کیں اور اپنے سامنے کھانا پکوا کر رات کو کھایا اور اپنے بچوں کو دیا تین روٹیاں بچی تھیں وہ اتا جان کو دیدیں کہ چاہے تو کھا یا اپنی اولاد کو کھلا۔ اتا جان نے دو چھوٹے بھائی کو کھلا دیں۔ ایک رکھی تھی وہ بلی لے گئی۔ وہ بھی بھوکی سوئیں اور میں بھی

کام پر گیا تو مجھے بھوک لگ رہی تھی کلا بتو ٹیر ہا ہو گیا تو خلیفہ نے مارا میں گھنٹہ بھر کی چھٹی لیکر آیا ہوں کہ بھائی کی دوالانی ہے۔ اسکا جی اچھا نہیں۔

(۱۶)

جیٹھ کا قیامت خیز مہینہ جب آسمان آگ برسا اور زمین اگل رہی تھی۔ بدنصیب سعیدہ تین سیر آٹا تھوپ چولہے سے باہر نکلی۔ اسکے کپڑے چکٹ تھے میلے تھے اسکی جوتی ٹوٹی تھی کھلا تھی اسکا سر مہینوں کا گندہ ہوا چوڑیاں مہینوں کی پہنی ہوئی عورت نہیں بدقسمتی کا مجسمہ و بیوی نہیں مصائب کی پوٹ تھی اس کی صورت دیکھکر خدا یاد آتا تھا باپ کی نفسانیت کا شکار اسکے چہرہ پر لکھا ہوا تھا کیسی بدنصیب کس قدر تقدیر پھوٹی کہ عمر کی ایک ساعت اور زندگی کا کوئی لمحہ چین یا اطمینان کا نہ گزرا پہلا شوہر پھر غنیمت تھا کہ اسکے راج میں یہ کوفت نہ تھی روپیہ پیسہ کیطرف سے بے فکر تھی بیسیوں نہیں سینکڑوں صرف کرتی تھی۔ مانگتی تھی اور وہ لاتا تھا۔ اٹھاتی تھی اور وہ دیتا تھا لیکن یہ خبر نہ تھی کہ تقدیر ایک اور گل کھلائیگی اور جفاکار باپ ایسے شخص کے ہاتھ میں ہاتھ دیگا جو الف کے نام بے نہ جانتا ہو بدمعاشوں کی سے مزاج اوباشوں کا سا گھر۔

آج تیسرا روز ہے کہ حاتم کا پتہ نہیں خاصا اچھا صبح کے وقت کارخانہ گیا دوپہر کو روٹی کھانے نہ آیا متفکر ہوئی شام سر پہ آئی مگر نہ آیا رات بھر دروازہ کھولے بیٹھی رہی ذرا سی آہٹ پر دوڑ کر جاتی اور ناکام آتی پھر کچھ کھٹکا ہوتا دوڑتی اور کہتی حاتم! مگر کچھ جواب نہ آتا چلی آتی۔ رات ختم ہوگئی شوہر اٹھا مگر یہ نہ پوچھا نہ پوچھنے کی ضرورت تھی کہ حاتم کہاں ہے خود اتنی مجال نہ تھی کہ کچھ کہہ سکتی یہ دن بھی صاف اور یہ رات بھی پوری گذری۔ دل کا جو حال تھا وہ خود ہی سمجھ سکتی تھی طرح طرح کے وہم قسم قسم کے وسوسے دل میں آتے تھے کبھی کہتی تھی کہ کسی جہنم

سے استاد نے گز مارا میں نے یہ جسم اس واسطے اپنے خون جگر سے سینچا تھا اب روز رکو اللہ آمیں کی تھی کہ بیٹی کا خلیفہ لہولہان کر دے کیا خیر کیا ہو، کہیں کنوئیں میں تو نہیں ڈوب گیا۔ ایک ایک پیسہ کو ایک ایک روٹی کو محتاج ہے نوکروں سے بدتر ہے غلاموں سے ذلیل گت نکل گیا کہیں چلا گیا۔

ان ہی خیالات میں غلطاں پیچاں تھی پہلا خیال پختہ ہوا اور یقین کامل ہو گیا کہ بیشک کنوئیں میں ڈوبا اب دل کی حالت بگڑی اور ماتا نے زخمی کلیجہ پر برچھیاں لگانی شروع کیں۔ ایک ٹوٹے جھلنگے پر بیٹھی اسی چکر میں الجھ رہی تھی سر کا ہوش تھا نہ تن کا آنکھوں سے زار و قطار آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں دل امنڈ رہا تھا دل نے صدا دی کہ ایسا بدنصیب بچہ جسکو کم بخت ماں کے گھر سے کفن تک نصیب نہ ہوا۔ ہائے مجھے کیا معلوم تھا کہ اب یہ صورت مجھ سے ہمیشہ کو چھپتی ہے۔ کس منت سے کہہ رہا تھا کہ اماں جان شام تک بھوکا رہوں گا ایک باسی روٹی دیدیجیے۔ روکھی کھا لوں گا۔

کچھ سوچتے سوچتے آپ ہی آپ کہنے لگی، پیارے حاتم بے قصور ہوں روٹی میری نہ تھی۔ اسلیے کہ میں مجبور ہوں تو نے مجھے کفن کی بھی تکلیف نہ دی ہائے کوئی لاش نکالنے والا بھی نصیب نہ ہوا۔

سینہ کے اندر دل خیال یوسف میں مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا مگر بے بس تھی مجبور تھی قصد کرتی تھی کہ کپڑے پھاڑوں اور نکل جاؤں۔ اس کے خلیفہ سے پوچھوں رستہ چلتوں سے دریافت کروں اور شاگردوں سے کہوں شاید کسی نے میرے حاتم کو دیکھا ہو کنوؤں میں جا کر جھانکوں جنگلوں میں جا کر ڈھونڈوں لیکن ہائے تقدیر مجبور ہوں کیا کروں آج تیسرا دن ہے صاحب اولاد ہو کر مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ گھر میں ذکر تک نہیں کہ بے وارثا۔ حاتم کہاں گیا۔ میں خود ہی

کہوں کہ میرا حاتم کہاں ہے۔

بیتاب ہوکر ایک ٹھنڈا سانس بھرا کلیجہ پر گھونسا مارا ارادہ کر رہی تھی کہ پوچھوں مگر ابھی کچھ کہنے نہ پائی تھی کہ یہ الفاظ کان میں آئے۔

میں نے کہا تھا کہ پہونچیاں بھی دیدے کھا نہ جاؤں گا۔ اللہ چاہے مہینہ ڈیڑھ ہی مہینہ میں چھٹوا دوں گا۔

سعید۔ آپ نے بالیاں کہی تھیں۔

کارخاندار۔ پہونچیاں بھی کہی تھیں۔

سعید۔ اب لا دیتی ہوں۔

ایسی حالت میں کہ دل قابو میں نہ تھا۔ اٹھی اور کوٹھری کی طرف چلی دو ہی قدم چلی تھی کہ کارخاندار نے کہا۔

دیکھ تیرے چھوٹے بچے نے میرے منجھلے کا کرتا ناس کر دیا۔ عجب بے غیرت بچے ہیں پچاس دفعہ کہدیا کہ ابے ان بچوں سے بات نہ کیا کرو یہ تمہاری طرح بے وارثے نہیں ہیں مگر باز نہیں آتے۔ روپیہ گز کی چکن پونے دو روپے کا کرتہ خاک میں ملگیا۔

اتنا کہکر کارخاندار اٹھا اور سعید کے اس معصوم بچہ کو جس کی عمر زیادہ سے زیادہ پانچ سال کی ہوگی اور جس کا قصور صرف اتنا تھا کہ چکن کے پھول کو انگلی لگانے کا جذبہ ننھے سے دل میں پیدا ہوا۔ پکڑکر دونوں کان مروڑے اور اس زور سے تھپڑ مارا کہ یتیم بچہ جس کو نانا کی نفسانیت نے اس چکر میں پھنسوایا بلبلا گیا مظلوم ماجس کی آنکھیں بڑے بچہ کے فراق پر خون گرا رہی تھیں۔ بے گناہ بچہ کا یہ حشر دیکھکر تڑپ اٹھیں۔ اور یہ پہلا روز پہلا موقعہ۔ پہلا اتفاق تھا کہ ماتا کے جوش میں بے اختیار ہوکر سعید نے صرف اتنا کہا۔

کیوں مارتے ہو

کارخاندار۔ ماروں نہیں تو کیا پیار کروں۔

سعید۔ پیار کرنے کو تو میں نہیں کہتی۔

کارخاندار۔ پھر کیا بڑبڑا رہی ہے۔

سعید۔ بچہ بے قصور ہوا معاف کر دو۔

کارخاندار۔ جب تو پھپھتی اس کی حمایتی موجود ہے تو بچہ کہاں سے رہا۔

یہ کہتا ہوا کارخاندار اس لیے کہ بیوی نے میری شان میں اس قدر گستاخی کی غصہ میں بھنبھنا کر اس کے قریب آیا اور کہا۔

پہونچیاں نکالیں۔

سعید۔ نکالنے جا رہی ہوں۔

اب کارخاندار کو کہاں صبر تھا بھڑاس نکالنے کو یہ موقعہ اچھا کافی تھا تارکی چلکٹی سامنے رکھی تھی وہی اٹھا کر ماری اور کہا

یہ بھی کوئی اور سمجھا ہے۔

سعید۔ - - - - - - - - - - - - - - - -

کارخاندار۔ ذلیل کہیں کی۔

سعید۔ - - - - - - - - - - - - - - - -

کارخاندار۔ جوتی کھو رہی ہے نہ۔ ہٹ کر ٹھیک ہوئی

سعید۔ - - - - - - - - - - - - - - - -

(۱۷)

سعید کے ماتھے پر چلکٹی کا نشان موجود تھا. مگر بچہ کی مصیبت کے آگے، وہ ہر تکلیف فراموش کر چکی تھی، اس بلبل کی طرح جو یاد وطن اور فراق آشیانہ میں

چاروں طرف قفس کی تیلیوں سے ٹکراتی تو ہر آہ پر سر پھوڑ رہی تھی۔ مگر اس
زخم کا اندمال تو علیحدہ رہا کوئی متنفس اتنا نہ تھا کہ مرہم کا پھاہا رکھ دیتا۔ ستم پر ستم
اور غضب پر غضب یہ تھا کہ اف کرنے کی اجازت نہ تھی۔ کلیجہ کا ٹکڑا جیتا جاگتا
جس کے دم سے تمام امیدیں وابستہ تھیں جسکو دیکھکر ہر کوفت بھول جاتی
تھی آنکھوں کے سامنے سے غائب ہوا۔ پھول سا لال جو اناؤں اور ماماؤں
اور کھلائیوں کی گود میں پلا تھا جس کے قدموں میں لوگ آنکھیں بچھاتے تھے
ایک بیدرد جاہل اور کٹر شخص کے ہاتھ سے پٹا۔ آپ جو اتنی عمر تک وجود یا اتفاق
کے نوکروں پر حکومت ماماؤں پر تسلط اور گھر پر راج کرتی رہی تھی باپ کے طفیل
ایک شقی القلب بدبخت کے ہاتھوں ذلیل ہوئی رسوا ہوئی مار کھائی لیکن یہ مجال
نہ تھی کہ شکایت کا ایک حرف زبان پر آسکے۔ ہم سعید کی طبیعت سے اچھی طرح
واقف تھے ہماری آنکھوں کے سامنے چھوٹی سے بڑی ہوئی۔ ہم نے اسکا بچپن
دیکھا جوانی دیکھی سہاگ دیکھا بیوگی دیکھی ہمارا ایمان ہے کہ ایک چلکی کیا ہزار لاتیں
اور باتیں اسکا جسم زخمی اور سینہ چھلنی کرتیں صبر اور شکر اطاعت اور فرمانبرداری
جو ایک بیوی کے جوہر ہیں قدرت نے اسکی رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بھرے تھے
اس سے زیادہ انسانیت اور شرافت اس سے بڑی اطاعت کیا ہوگی کہ پہلے
شوہر کی ہر جا و بیجا خفگی کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ کٹر باپ کے حکم کے روبرو
خلاف خواہش گردن جھکائی۔ زبردستی کے شوہر کار خاندار کے سامنے ستم پر
خاموش رہی یقین ہی حق الیقین عین الیقین کہ سعید فطرتاً ایسی نیک مذہباً ایسی
مخلص اور قیاساً ایسی نیک کوک کی بیٹی تھی کہ ٹکڑے اڑ جاتے اور تیوری
پر بل نہ لاتی۔ کار خاندار بدمعاش تو کیا ایک دنیا کو معلوم ہو جاتا کہ تعلیم عورت
کو پارس بنا دیتی ہے مگر محمود جیسے بچہ کی زندہ موت ایسی نہ تھی کہ قلب مضطرب

تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو جاتا۔ اور جو آگ کلیجہ میں لگ رہی تھی اس کا دھواں
منہ سے نہ نکلتا۔

دوپہر کا وقت تھا دیوانوں کی طرح انگنائی میں چکر کاٹ رہی تھی اور سات
روز گذر جانے پر بھی دروازہ پر نگاہ تھی کہ شاید وہ بھولی صورت نظر آجائے
وہ پیاری باتیں ایک دفعہ کان اور سن لیں۔ کہ کچھ خیال آیا دالان میں آئی۔ کاغذ ہاتھ میں
لیا اور قصد کیا کہ برابر میں جو مسلمان ڈپٹی صاحب رہتے ہیں ان کو خط لکھوں مگر حیا نے
ہاتھ پکڑ لیے۔ شرافت نے زبان روکی اور دل نے کہا گھر کی ہوا نکلتی ہے لطف یہ ہے
کہ جلکر خاک ہو جاؤں اور بھاپ نہ نکلے۔ مگر ممتا نے حیا کو ٹھکرا دیا اور کہا حاتم میرا بچہ
تھا میں نے اسکو نو مہینہ پیٹ میں رکھا ڈیڑھ برس دودھ پلایا چھ سات برس
پالا آج وہ مجھ سے ہمیشہ کو جدا ہو جائے اور میں کڑھوں جلوں ماں زندہ رہوں کھاؤں
پیوں رہوں سہوں اور اسکی پرواہ نہ کروں میں نے دوسرا نکاح کیا اپر مصیبت
ڈہائی اپنے ہاتھ سے ہری بھری کوپل ملیامیٹ کی میں اس کے بعد زندہ رہوں اور
نہ ڈھونڈوں۔ ماں ہوں ڈائن نہیں اس کی لونڈی ہوں دشمن نہیں اگر سنگدل ملا
بے درد مسلمان معترض ہوں کہ ایک غیر مرد کو رشتہ نہ ناتا جان نہ پہچان خط لکھتی
ہوں تو دیوانے ممتا سے ناواقف لگی سے ناآشنا بکیں اپنے منہ سے بکا کریں
کہیں اپنی زبان سے کہتے رہیں میرا کلیجہ زخمی میرا دل چور میں مجبور ہوں خدا مارے
یا چھوڑے عذاب ہو یا ثواب۔ دوزخ ہو یا بہشت میرا بچہ مجھ سے ملجائے اسکے
بعد سعیدہ کچھ دیر خاموش رہی کچھ سوچا۔ اور لکھنا شروع کیا۔

"سلام علیکم سنتی ہوں کہ آپ حاکم ہیں اور پڑھا ہے کہ مظلوم کی اعانت ثواب
ضرورت ہے کہ کچھ کہوں اور مجبور ہوں کہ تھوڑی سی تکلیف دوں مجھے اس تکلیف
کا حق ہے اسلیئے نہیں کہ ہمسایہ ہوں۔ اس سے کہ آپ متعرف نہ ہوں۔ خدا سوا مجھے

کہ مسلمان ہوں یہ غالباً آپ کے خیال میں لغویت ہوگی بلکہ اس لیئے اور صرف اسلیئے کہ مظلوم ہوں بدنصیب ہوں۔ وقت نے میرا عیش اجاڑا میری حیا شرم ختم کی اور آج یہ دن ہے کہ جو ہاتھ حقیقی اور مجازی خدا کے سوا کسی انسان کے آگے نہ پھیلے وہ اسوقت آپ سے رحم کے ملتجی ہیں۔

میں کون ہوں یہ جانے دیجیئے مصیبت کی ماری۔ ظالم کی ستائی وہ بے وارثی جسکا وارث وہ بیکس جسکا حمایتی خدا کے سوا کوئی نہیں مفصل داستان بے سود اور پوری رام کہانی بیکار۔ فریادی ہوں۔ بھکارن ہوں عقل زائل حواس باطل سائل ہوں رحم کی ملتجی ہوں کرم کی۔

دل میں ہوک اٹھتی ہے کیونکر کہوں میری آٹھ سال کی کمائی لٹ گئی۔ میرا چمن اجڑ گیا میری بہار مٹ گئی میرا پہلونٹھی کا بچہ حاتم جیتا جاگتا آج آٹھ روز ہوئے کہ میری آنکھوں سے اوجھل ہے۔ ذلیل ماں کا بچہ بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ جوہر شرافت زائل نہ ہوئے آبائی خون رنگ لایا اور غیرت کا پتلا بے غیرت ماں کا کلیجہ توڑ نہ معلوم کہاں گیا اور کدھر اڑا۔ زندہ ہے یا مردہ زمیں پر ہے یا آسمان پر۔

مردہ شوہر کی جنتی روح کانپ اٹھے گی اگر کہوں کہ کس کا بیٹا اور کس کا پوتا مگر یہ بتانا گناہ نہیں کہ اس باپ کا بیٹا تھا دولت جس کے قدموں میں لوٹی اور جس نے تینتیس سال کی عمر میں ایک لمحہ کو انسان کا احسان نہ اٹھایا۔ جب موت نے غیرت مند باپ کا چہرہ خاک میں ملا یا تو بے حیا ماں بیوی کا برقع سر پر ڈال گھر سے باہر نکلی خدا کا ذبیح ماں کا بھر اپڑا تھا مگر بدنصیب بیوہ کیواسطے میکے کے سوا کوئی پناہ کی جگہ نہ تھی۔ یہ غلطی ہے دنیا اور دنیا والے اگر اس گھر کو میکا کہیں اور اپنا سمجھیں۔ جو مائی زندگی سے محروم ہو چکا ہو میرا باپ اگر بیوی لانے کے بعد فرشتہ ہو جاتا تو حاشا و کلا شکایت نہ تھی۔ میں اب یہی کہ وہ محسن ہے آقا ہے

باپ ہی ملزم نہیں سمجھتی۔ ضرورتوں سے مجبور واقعات سے لاچار اور حالات
سے متاثر ہو کر اس نے نکاح کیا درست کیا خوب کیا مگر تکمیل سے قصد سے قبل
عالم ضعیفی کی بیجوں پر میری ہستی کا تخیل کانٹا بن کر کھٹکا اور پتھروں کے ناپاک جذبہ
نے میری نکالنے کی کوشش کی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے الفاظ اس انسان
کو جو آخر میرا باپ ہی ہے مجرم نہ قرار دیں لیکن کیا کروں او ہر وہ ہے جس کی اولاد
ہیں اور ہر وہ جو میری اپنی اولاد ہے۔ بیوہ بچی کا گھر سے نکالنا آسان کام نہ تھا
ایک جاہل بڈھا زر و زر غنیمت سمجھ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیا۔ اس سے بڑھ کر
ظالمانہ فعل اس سے زیادہ وحشیانہ حرکت دنیا میں مشکل سے ہوگی وہ انسان
نما جانور جو میرا شوہر تھا۔ انصاف اور ایمان سے ہزاروں کوس دور ہے
انسانیت اس کو چھو نہ گئی۔ میں ایک بے گناہ مجرم کی طرح اس کے پاس
مقید ہوں۔ میرے معصوم بچے غلاموں کی طرح اسکی اور اس کے بچوں کی
خدمت میں مصروف ہے لیکن اسکا دل موم نہ ہوا مظلوم بچوں پر میری آنکھ کے
سامنے چار چوٹ کی مار پڑی جسم پر بدھیاں اور منہ پریشان ہوئے مگر بے وارثے
بچوں کی تیوری پر بل نہ آیا۔ میرے دل پر جو کچھ گذری ہیں۔ بیان نہیں کر سکتی۔
خیال کیجئے کہ وہ کیا وقت ہوگا جب ایک ایل۔ ایل۔ بی کا لڑکا مدرسہ سے اٹھکر
ٹٹی کے کام پر بیٹھتا ہے۔ ماں کے کان سنتے ہیں کہ سوتیلا باپ یہ ستم توڑ رہا ہے۔
اس کی آنکھیں دیکھتی ہیں کہ مدرسہ جانیوالا بچہ کام پر جا رہا ہے استاد اس کی
کھال اڑاتا ہے خلیفہ اس کے گزر جاتا ہے مگر ماں میں قدرت نہیں رہتی کہ اف
کر سکے وہ دیکھتی ہے کہ سارا گھر میٹھا کھانا کھا رہا ہے شوہر کے پہلے بچے پیٹ
بھر رہے ہیں مگر اسکا معصوم بچہ کا پیاسا کام پر جا رہا ہے اسکا دل کیا کہتا ہوگا
یہ آپ کہئے اس بچہ پر کیا گذرتی ہوگی یہ خدا جانے۔ اب کہ میری آنکھیں اپنے

لال کا رستہ دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں اور دل کی ہوک لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہی ہے۔ ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی ہوں اپنے بچوں کا صدقہ میرا بچہ مجھ سے ملوا دیجیے"

رات کے دس بجے تھے کارخانہ دار بے خبر پڑا سوتا تھا کہ ماماں کی ماری ایک میلی سی چادر اوڑھے پرچہ ہاتھ میں لیے باہر نکلی۔ اور ڈپٹی صاحب کے مکان میں گھسی شرم کے مارے جسم تھرتھر کانپ رہا اور خوف کے سبب سے دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا مگر لگی کے آگے سب ہیچ تھا اندر پہونچی۔ ڈپٹی صاحب بیٹھے حقہ پی رہے تھے پوچھا کون ہے رو کر قدموں میں گری پرچہ ہاتھ میں دیا اور کہا۔

"میرا کام کر دیجیے خدا آپ کا کام کر دے گا"

ڈپٹی صاحب کی تیوری پر بل آگیا۔ بادل ناخواستہ پرچہ پر ایک نظر ڈالی اور کہا ہم سے واسطہ نہیں کوتوالی جاؤ۔

باہر آئی اور پوچھتے پوچھتے اس کے کارخانہ گئی۔ تو معلوم ہوا دریا میں ڈوب کر مر گیا۔ اب دل کا خدا حافظ تھا ٹکریں مارتی تھی۔ سر پھوڑتی تھی مگر دل کسی طرح چین نہ لیتا تھا گھر پہونچی دونوں بچوں کو گود میں لیا اور اندھیرے کنوئیں پر پہنچ کر سر کی چادر اتار بچوں کو چھاتی سے باندھا آسمان کی طرف دیکھا اور کہا خود کشی نہیں لال کی تلاش ہے۔ یہ کہا اور کنوئیں میں گر پڑی ﷲ